معلم شخصیت اور فرائض

تعلیمات نبویہ کے آئینے میں

مولانا محمد وسیم راؤ☆

لفظ معلم، تعلیم کا اسم فاعل ہے اور تعلیم باب تفعیل سے (۱) سکھانے کے معنی میں آتا ہے، اس طرح معلم کے معنی ہیں سکھانے والا۔ اور تعلیم کا ثلاثی علم ہے (۲) جس کے معنی آگاہی، پہچان اور جاننے کے ہیں تو اس اعتبار سے معلم آگاہ کرنے والا، پہچان کرانے والا اور علم دینے والا کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ گویا اپنے خاص عمل کے ذریعے جو شخص دوسروں کو علم سکھاتا ہے وہ معلم کہلاتا ہے۔

انگریزی میں تعلیم کے لئے لفظ Education (۳) استعمال ہوتا ہے جو کہ لاطینی زبان کے لفظ Educare سے ماخوذ ہے جس کے معنی تربیت دینے کے ہیں (۴)۔ انسائیکلوپیڈیا آف ڈکشنریز کے مطابق تعلیم (Education) انسانی ذہن اور مختلف اعضا کو مہذب و تربیت یافتہ بنانے کا نام ہے۔ (۵) اس اعتبار سے اس کا فاعل یعنی معلم Educator وہ شخص ہے جو انسانی ذہن اور اس کے مختلف اعضا کی تہذیب اور تربیت کرتا ہے۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ معلم دراصل انسان کی تہذیب و تربیت کرنے والے کو کہا جاتا ہے، قرآن کریم نے بھی معلم کے لئے یہی معنی اور کام بیان کئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ق وَيُزَكِّيهِمْ (٦)

وہ (پیغمبر) ان کو سکھاتا ہے کتاب اور حکمت اور ان کا تزکیہ کرتا ہے

قرآن حکیم کے دوٹوک بیان کے مطابق اس فریضہ کو سرانجام دینے والے خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ ہیں، اور وہ اپنے متعلق فرماتے ہیں:

انما بعثت معلِّماً (۷)

مجھے تو سکھانے والا ہی بنا کر بھیجا گیا ہے۔

☆ تحقیق کار، شعبہ تعلیم، جامعہ کراچی

لہذا یہ بات قرآن اور ارشاد رسول سے ثابت ہے کہ معلم، انسان کی مکمل تربیت کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ ذہنی اعتبار سے معلومات فراہم کرنا اور جوارح کے اعتبار سے عمل پر ڈالنا اور پھر ظاہر و باطن کو علم کے نور سے آراستہ و پیراستہ کر کے ایک انسان کو مہذب و تربیت یافتہ بنا دینا معلم کا کام ہے۔

شانِ معلم:

معلم حقیقی کون ہے تو اس بارے میں قرآن کا بیان بالکل واضح ہے کہ حقیقی معلم خود حق تعالیٰ شانہ ہیں: جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

وعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا (۸)

اور سکھائے اس (اللہ) نے آدم کو تمام (اشیا کے) نام۔

اسی طرح آنحضرت ﷺ پر نازل کردہ پہلی وحی میں اللہ تعالیٰ نے اپنی شان معلّمی کو یوں بیان فرمایا۔

اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِO عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْO (۹)

وہ ذات جس نے قلم کے ذریعے سکھایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا، جس کو وہ نہیں جانتا تھا۔

سورۃ الرحمٰن میں فرمایا:

اَلرَّحْمٰنُO عَلَّمَ الْقُرْاٰنَO خَلَقَ الْاِنْسَانَO عَلَّمَہُ الْبَیَانَO (۱۰)

رحمٰن (وہ ذات ہے) جس نے قرآن سکھایا۔ اس نے انسان کو پیدا کیا، اس کو بولنا (اظہار مافی الضمیر) سکھایا۔

اسی طرح مزید آیاتِ مبارکہ میں بھی بالکل صراحتاً اللہ کی صفت معلّمی کا اظہار ہے۔

ایک حدیث مبارکہ میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

ادّبنی ربیّ فاحسن تأ دیبی. (۱۱)

میرے رب نے مجھ کو ادب سکھایا اور میری بہترین تربیت کی

یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی صفت معلّمی کا اظہار ہے۔

الغرض یہ طے شدہ امر ہے کہ معلم حقیقی خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہیں اور مخلوق میں بھی وہی لوگ ذی

مرتبہ اور ذیشان ہیں جو خدا کی اس صفتِ خاصہ سے متصف ہیں۔

انبیا کرام علیہم السلام ذی مرتبہ ہیں تو اسی بنا پر کہ وہ انسانوں کے معلم ہیں اور اللہ کی صفت معلّمی کے خصوصی مظہر ہیں۔ ہر نبی و رسول دراصل سکھانے والا ہی ہوتا ہے۔ سرور کونین ﷺ چونکہ اس معاملے میں بھی افضل ہیں لہذا آپ انبیا کے امام ہیں۔

علوم طبعیہ، مادیہ کی تعلیم دینے والا شخص کیونکر صاحب فضلیت ہے؟ کیا ایسا شخص خاص صفت تعلیم میں خدا کی خلافت کا مظہر ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جو علوم مادیہ، طبعیہ سکھانے والے اساتذہ کے اپنے ذہن میں بھی آسکتے ہیں اور ان کے متعلق سوچنے والوں کے ذہن میں بھی آسکتے ہیں۔ کیونکہ ماقبل تمہید سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ وہ سب دین اور روحانیات اور علوم آخرت کی تعلیم کا بیان ہے اور اسی تعلیم کے فضائل ذکر ہو رہے ہیں۔ ان فضائل و کرامات کا تعلق علوم طبعیہ مادیہ سے کس طرح ہے، اور ایک ٹیچر جو فزکس پڑھاتا ہے کیمسٹری پڑھاتا ہے یا کسی اور مضمون کی تعلیم دیتا ہے وہ کیسے ان فضائل و کرامات کا مستحق ہوسکتا ہے؟

مزید وضاحت کے ساتھ یہ سوال یوں کیا جاسکتا ہے کہ ایمان کیا ہے، عبادات کیا ہیں، کیسے ادا کرنی ہیں۔ اخلاق کیا ہیں، جنت اور جہنم کیا ہے یہ تعلیم اللہ نے دی اس کے رسولوں نے سکھائی لہذا جو انسان یہ تعلیم دیتا ہے وہ یقیناً معلّم ہے۔ لیکن جو شخص یہ پڑھاتا ہے کہ ایٹم Atom کیا ہے، الیکٹرون Electron کیا ہے، سونے Gold کے کیا خواص ہیں، یہ کہاں سے کس طرح حاصل کیا جاتا ہے۔ راکٹ Rocket کیا ہے، کیسے بنایا جاتا ہے اس کو زمین سے باہر فضا میں کیسے پہنچایا جاتا ہے۔ مختلف جڑی بوٹیوں کی پہچان کرانا اس کے خواص کا علم دینا، جغرافیہ کی معلومات فراہم کرنا، مختلف زبانیں سکھانا، انسانی تاریخ کا علم دینا، وغیرہ تو کیا ان باتوں کا سکھانے والا شخص بھی ''معلم'' ہے، اور وہ بھی خیر و خوبی کا حامل ہے؟

ان تمام سوالوں کا جواب قرآن و حدیث کے مطابق اثبات میں ہے کہ ہاں یہ لوگ بھی فضائل و کرامات کے مستحق ہیں۔ اور یہ بھی معلم کہلانے کے حق دار ہیں، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے،

خدا ہے معلم ، معلّم رسول
معلّم پہ ہے رحمتوں کا نزول

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (۱۲)

اللہ نے آدم کو تمام اشیا کے نام (اور خواص) سکھائے

تفسیر ابن کثیر میں ہے:

عن ابن عباس أعلّمه اسم الصحفة و القدر قال نعم حتى الفسوة و الفسية. (۱۳)

کسی نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا اللہ نے کتاب اور تقدیر کا علم سکھایا تو فرمایا کہ ہاں اللہ نے تو ریح خارج کرنے کی تعلیم بھی دی۔

یعنی ریح کے خارج ہونے کا نام اور ضرورت وغیرہ بھی سکھائی۔

اسی طرح علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں قول نقل کیا ہے کہ:

ان اللّٰه تعالیٰ لو اغفل شیاً لأغفل الذرّة و الخردلة و البعوضة (۱۴)

اللہ تعالیٰ اگر آدم (انسان) کو کوئی چیز نہ سکھاتے تو وہ ذرّہ (کا نام) اور رائی (کا نام) اور مچھر (کا نام) ہوسکتا تھا

لیکن اللہ نے ان حقیر چیزوں کا علم بھی انسان کو دیا، اللہ رب العزت نے ہر اعلیٰ اور ادنیٰ شئے کا علم عطا کیا۔ یہاں تک کہ ہر خیر اور شر کی تعلیم انسان کو دی اور پھر عمل کا اختیار عطا کیا کہ چاہو تو ان اشیا کو بھلائی کے استعمال میں لاؤ، اور چاہو تو برائی میں استعمال کرو۔ جیسا کہ ارشاد ہے،

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شٰكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا O (۱۵)

ہم نے اس کو (صحیح) راستہ دکھادیا اب چاہے تو وہ شکر گزاری کرے چاہے ناشکری کرے۔

قرآن حکیم کے ارشادات کے مطابق حضرات انبیائے کرام جو معلم ہونے کے اولین مصداق ہیں انسانوں کو علوم دین وشریعت کے ساتھ ساتھ علوم مادّیہ کی تعلیم بھی دیتے تھے اور ان کو یہ علوم خود اللہ رب العزت نے سکھائے تھے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا علم سکھایا گیا اور پھر دوسرے انسانوں نے ان سے کشتی بنانا سیکھا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا (۱۶)

اور (اے نوح) آپ کشتی بنایئے ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم کے مطابق

صاحب لمالین نے وحینا کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے، ای تعلیمنا یعنی ہمارے سکھانے کے

مطابق اور آگے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیلؑ کو حکم فرمایا کہ نوحؑ کو کشتی بنانا سکھائیں۔ چنانچہ انہوں نے طریقہ سکھایا جس کے مطابق تین سو ہاتھ لمبی پچاس ہاتھ چوڑی اور تیس ہاتھ بلند تین منزلہ کشتی تیار کی گئی۔

مختلف اقوال کو دیکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ کشتی نہیں بلکہ ایک پورا جہاز تھا۔ جس میں تقریباً ستاسی افراد اوپر کی منزل میں، دوسری منزل میں کھانے پینے کا سامان اور پہلی منزل میں تمام جانوروں کے جوڑے سوار تھے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وحشی اور پالتو جانوروں کے جوڑے الگ الگ منزلوں میں تھے۔(۱۷)

ظاہر ہے اس صنعت کیلئے حضرت نوح علیہ السلام کو سب سے پہلے لوہے کے آرے بنانا سکھایا گیا ہوگا پھر ان کے ذریعے درختوں کو کاٹنا اور ان کے بڑے بڑے تختے تیار کرنا پھر ان کو میخوں کے ذریعے مختلف زاویوں اور گوشوں میں جوڑنا سکھایا گیا ہوگا اور پھر کشتی چلانے کیلئے بادبان اور چپو وغیرہ کا پورا علم دیا گیا ہوگا۔

چنانچہ ان تمام لوازماتِ صنعت کی تعلیم حضرت جبرئیل نے اللہ کے حکم کے مطابق دی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ رب العزت نے زرہ سازی کی تعلیم دی اور ان سے دوسرے انسانوں نے یہ علم سیکھا۔ قرآن کریم کا بیان ہے کہ:

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (۱۸)

اور ہم نے اس (داؤد) کو سکھائی (زرہ سازی کی) کاریگری تمہارے پہننے کیلئے تاکہ جنگ میں وہ تمہاری حفاظت کرے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذریعے ہواؤں کو مسخر کرنے، معدنیات کو تلاش کرنے اور استعمال کرنے کا علم دیا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ؕ (۱۹)

اور سلیمان کیلئے ہوا کو تابع کر دیا کہ اسکی صبح کی منزل ایک مہینے کی مسافت کے بقدر تھی (یمن کی طرف) اور شام کی منزل ایک مہینے کی مسافت کے بقدر تھی (فلسطین کی طرف) اور ان کیلئے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے خوابوں کی تعبیر اور غلہ محفوظ طور پر ذخیرہ کرنے کا علم دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ (۲۰)

اور تیرا رب تجھ کو سکھائے گا خوابوں کی تعبیر

اور ارشاد ہے:

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ ○ (۲۱)

یوسف نے کہا تم سات سال تک غلہ بویا کرنا پس جو تم فصل کاٹو اس کو بالوں (خوشوں) میں ہی رہنے دینا سوائے اس تھوڑی سی مقدار کے جس کو تم کھاؤ۔

حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں روایت ملتی ہے کہ:

اوّل من خطّ و خاط فهو اخنوخ سمّی ادریس لکثرة درسه (۲۲)

پہلا شخص جس نے لکھنے اور سینے پرونے کا کام کیا وہ اخنوخ تھے کثرت درس کی وجہ سے ان کا نام ادریس ہو گیا

یعنی علوم شریعت کی تدریس کے ساتھ ساتھ کثرت سے لکھنے اور سینے پرونے کی تعلیم بھی دیتے تھے چنانچہ وہ اصلی نام اخنوخ کی بجائے ادریس یعنی سکھانے والا کے نام سے مشہور ہوئے۔

سید الکونین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جہاں دین و شریعت کے سکھانے میں معلم اعظم ہیں وہیں آپ اللہ تعالیٰ کے عطاء کردہ علوم مادیہ کی تعلیم بھی صحابہ کو دیتے تھے، خصوصاً علم طب کی تعلیم کا بیان کتب احادیث اور طب نبوی پر لکھی جانے والی کتابوں میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے کہ آنحضرت علیہ السلام نے کس طرح جڑی بوٹیوں سے علاج کرنا، پرہیز کرنا اور مختلف تدابیر اختیار کرنا بغرض علاج و صحت سکھایا۔ (۲۳)

ان دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے مادّی علوم اور اشیاء و اسماء کی تعلیم بھی انسانوں کو دی، اگر چہ کہ ان کا فریضۂ حقیقی اور وظیفۂ اصلی تو دین و شریعت ہی سکھانا ہوتا ہے۔

چنانچہ فقہائے امت نے تصریح کی ہے کہ وہ تمام علوم جو تجربی اور عقلی ہیں اور جن کا وجود نوع انسانی کی بقا اور زندگی کے لئے از بس ہے ان کا سیکھنا اور سکھانا امت پر فرضِ کفایہ ہے۔ مثلاً زراعت کا

علم، حساب و کتاب کا علم۔ جغرافیہ کا علم وغیرہ اور ہر دور کے اعتبار سے جدید اور ضروری علوم بھی اس میں داخل ہیں۔ (۲۴)

چنانچہ علمائے اسلام نے علوم کو دو بڑی اقسام پر تقسیم کیا ہے اور کہا ہے:

العلم علمان علم الادیان و علم الابدان (۲۵)

علم کی دو قسمیں ہیں ایک علم دین کا اور دوسرا جسم کا

دین کا علم وہ ہے جو روح انسانی کی ضرورت ہے اور خصوصاً اخروی زندگی کی فلاح کے لئے ہے۔ اور بدن کا علم وہ ہے جس کے ذریعے انسانی جسم کو فعال رکھا جا سکتا ہے۔ اور خصوصاً اس کا تعلق دنیا میں انسان کی بقا سے ہے۔

اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ موجودہ طبعی اور دنیاوی علوم کی تعلیم بھی مقصود و مطلب ہی ہے جب کہ وہ خدا کے احکامات کے تابع ہو اور یہ تعلیم و تعلّم دونوں ہی خدا کی منشاء اور اس کی خوشنودی کا ذریعہ ہیں اگر ان کے ذریعے خدا کی مرضی کا حصول مقصود ہو۔

چنانچہ ان علوم کو سکھانے والے بھی خدا کی منشاء کے پورا ہونے کا ذریعہ ہیں، اس اعتبار سے وہ اپنی اپنی نیت خیر کے بقدر فضائل و کرامات کے مستحق ہیں۔ البتہ یہ بات بہرحال طے شدہ ہے کہ علمائے شریعت و دین اور معلمین امورِ طبعیہ و دنیویہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ (۲۶)

تاریخ اسلام میں ایسے علماء شریعت و دین کثرت سے گذرے ہیں جو دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم سے بھی بہرہ ور تھے اور ان علوم کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ اور یہ لوگ زندگی کے تمام پیشوں بادشاہی سے لے کر جوتا سازی تک سے متعلق رہے ہیں۔ (۲۷) چنانچہ اس کی بڑی بڑی مثالیں تو یہ حضرات ہیں۔

شمس الائمۃ امام ابومحمد عبدالعزیز بن احمد بن نصر حلوائی	فقہ حنفی کے مشہور امام ہیں یہ حلوائی تھے
امام ابوعلی المرزوقی حائک	کپڑا بننے والے
ابومنصور احمد حلاج	روئی دھننے والے
ابوعبداللہ خطیب اسکاف	جوتا گانٹھنے والے
ابوبکر بناء مقدسی شامی	یہ شام کے بڑے عالم اور فن تعمیر کے امام تھے
امام ابوحنیفہ بزاز	کپڑے کے بڑے تاجر تھے

یہ حضرات نہ صرف ان پیشوں سے متعلق تھے بلکہ وہ ان پیشوں کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔

ایک حدیث مبارکہ ہے

خیر النّاس انفعھم للنّاس (۲۸)

بہترین انسان وہ ہے جو لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچانے والا ہے۔

امور طبعیہ اور دنیاوی علوم سکھانے والے اساتذہ یقیناً لوگوں کو نفع پہنچاتے ہیں لہذا وہ بھی اس فضیلت کے مستحق ہیں۔

یہاں تک تو یہ بیان تھا کہ اسلام نے استاد کا کیا مقام و مرتبہ بیان کیا ہے اور اسلام میں استاد کا کیا کردار ہے۔ آیئے اب ہم جدید نظام تعلیم میں استاد کے مقام کو دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں کیا کہا گیا ہے،

استاد اور جدید نظامِ تعلیم

یہ امر مسلمہ ہے کہ تدریس کی جملہ سرگرمیاں معلم ہی کے دم سے قائم ہیں، زمانہ لاکھ تعلیمی و تدریسی اصلاحات پیش کرے لیکن معلم کی اہمیت اور حیثیت کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

ماہرین تعلیم William Iverson اور Brown کے مطابق ''مدرسہ بھی شخصیت رکھتا ہے اس کا وقار اور شخصیت معلم ہے۔ مدرسے کی ساری رونق اور زندگی معلم کے دم سے ہے۔ کوئی تعلیمی نظام اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ معلم اپنا عمل شامل نہ کرے۔ بالفاظ دیگر معلم کے تعاون کے بغیر نصاب تعلیم طریقۂ تدریس اور امدادی اشیاء بیکار اور غیر مؤثر ہیں''۔ (۲۹)

اسی لئے اکبرالہٰ آبادی نے کہا ہے ؎

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی، آدمی بناتے ہیں

موجودہ جدید دور میں جو نظامِ تعلیم و تدریس رائج ہے وہ ایک منظم اور مربوط پروگرام ہے۔ ایک ادارے کی حد تک بھی ایک ملک کی سطح تک بھی اور عالمگیر پیمانے پر بھی.

الغرض تعلیم اب ایک منظم سرگرمی (Organized Activity) ہے۔ اور ہر مرحلے اور ہر سطح پر اسکے قواعد وضوابط طے شدہ ہیں۔

معلم کے لئے پیشہ ورانہ ضابطہ کار اور ضابطہ اخلاق متعین ہے جس کے تحت معلمین اپنے

فرائض سرانجام دیتے ہیں اور اسی کے تحت افراد اور ادارے ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔

معلمین جن طے شدہ ضوابط کار کے مطابق اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں ان تمام اصول و ضوابط کا جائزہ ہم تعلیمات اسلامیہ اور سیرت رسول ﷺ کی روشنی میں لے سکتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے اتنی بات پیش نظر رہے کہ معلمی درحقیقت فرائض اور ذمہ داریوں ہی کا نام ہے، ایک انسان کی مکمل تربیت و پرورش کرنا اور اسے دنیا میں کامیابی کے ساتھ جینے کے قابل بنانا اور آخرت کے اعتبار سے کامران کرنا یہ دشوار گذار کام معلم کے کاندھوں پر ہوتا ہے۔ یہ ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ اور حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے۔

کلکم راع و مسئول عن رعیتہ (۳۰)

تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال ہوگا۔

اب معلم خود دیکھ لے کہ اس کے زیر نگرانی کس کو دیا گیا ہے اور اس کے متعلق کیا پوچھا جائیگا۔

فرائض و واجبات:

معلم کے فرائض و واجبات کا دائرہ کار مختلف پہلوؤں میں منقسم ہے۔

۱۔ معلم اور تعلیمی ادارے کا تعلق (معاہدۂ ملازمت، اجارہ)

۲۔ سربراہ ادارہ سے تعلق (اطاعت امیر)

۳۔ طلبا سے تعلق: تعلیم، تدریس، تربیت (ادائیگی فرض)

۴۔ ادارۃ کی اشیا کا استعمال (امانت و دیانت)

۵۔ دوسرے اساتذہ اور انتظامی عملے سے تعلق (خلق باہمی)

۶۔ معاشرتی تعلق خصوصاً والدین سے (حسن معاشرت)

۷۔ ذاتی حیثیت اور اوصاف (حسن سیرت)

۱۔ معلم اور تعلیمی ادارے کا تعلق: (اجارہ)

تعلیمی ادارے سے معلم کا تعلق ایک معاہدے (ملازمت) کے تحت قائم ہوتا ہے۔

اب اگر ادارہ نجی ہے تو اس کے مالکان اور استاد کے درمیان یہ معاہدہ طے پاتا ہے اور اگر ادارہ حکومت کا ہے تو حکومت اور استاد کے درمیان یہ معاہدہ طے پاتا ہے۔

الغرض یہ ایک باقاعدہ معاہدہ ہوتا ہے جس کے تحت استاد اپنی خدمات سرانجام دیتا ہے اور ان خدمات کے بدلے مالی منفعت (تنخواہ) دیگر سہولیات اور مراعات حاصل کرتا ہے۔ شرعاً اس معاہدہ پر معاملہ اجارہ کی تعریف صادق آتی ہے۔ یعنی ادارہ آجر ہے اور استاد اجیر ہے۔

چنانچہ معاملۂ اجارہ میں ایک اجیر کی کیا ذمہ داریاں ہیں اس بارے میں تعلیماتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں بہت واضح ہدایات ملتی ہیں۔

معاہدہ ملازمت میں استاد کے لئے دو امور نہایت بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ پابندیٔ وقت، ۲۔ تفویض شدہ تدریسی وانتظامی ذمہ داریوں کی ادائیگی۔

ادارے میں کام کے اوقات متعین ہوتے ہیں مثلاً صبح ۸ بجے سے دوپہر ایک بجے تک (یا کوئی اور اوقات) بہرحال چند گھنٹوں کا وقت کام کے لئے متعین ہوتا ہے اور مقررہ وقت سے قبل ادارے میں حاضری ضروری قرار دی جاتی ہے بعدازاں چھٹی تک مکمل وقت ادارے میں موجود رہنا ضروری ہوتا ہے۔

اس پابندیٔ وقت میں اپنی کلاس میں مقرر وقت پر پہنچنا اور پیریڈ مکمل ہونے تک کلاس میں موجود رہنا بھی ضروری ہے۔ تدریس کے علاوہ بعض نگرانی اور تربیتی امور کے لئے بھی استاد کی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے، اسی طرح ہم نصابی سرگرمیوں کیلئے طلبا کو اسکول کی چار دیواری اور کبھی کبھار اسکول سے باہر بھی لے جایا جاتا ہے۔ ان امور کی نگرانی بھی استاد کے ذمے ہوتی ہے اس لئے یہاں بھی استاد کو مکمل وقت موجود رہنے کے ساتھ ساتھ مکمل سرگرمی کی تکمیل کروانا ہوتا ہے۔ مزید برآں امتحانی اوقات میں امتحانات کی نگرانی بھی استاد کی ذمہ داری ہے اور اس کے لئے متعین اوقات میں استاد کو ڈیوٹی ادا کرنا ہوتی ہے۔

اسکول میں طلبہ کے آنے جانے کے اوقات میں اور وقفہ تفریح Interval کے دوران بھی استاد ہی نگرانی کے فرائض سرانجام دیتا ہے اور وہاں اس کو اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے، استاد کو وقت اور کام دونوں کی مکمل ادائیگی کرنا لازمی ہے کیونکہ انہی دو چیزوں کے عوض وہ طے شدہ تنخواہ اور مراعات کا حق دار بنتا ہے۔

اب اگر استاد وقت میں کمی کرتا ہے یا وقت کی پابندی نہیں کرتا اور اپنے کام میں کوتاہی کرتا ہے، مثلاً پورے پیریڈ میں محض تھوڑے سے وقت طلبہ کو پڑھاتا ہے اور پھر آرام سے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے یا وہیں بیٹھ کر اپنے کسی کام میں یا غیر ضروری کام میں لگ جاتا ہے تو یہ فرض کی ادائیگی میں کوتاہی اور خیانت ہے۔

ہلاکت ہے کمی کرنے والوں کے لئے۔ وہ لوگ جب دوسروں سے لیتے ہیں تو
ناپ کر پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کر دیتے ہیں۔

ان آیات کی وعید میں وہ ملازم بھی داخل ہے جو طے شدہ معاوضہ لینے کے باوجود کام چوری کا مرتکب ہو اور اس نے اپنے جو اوقات آجر کو بیچے ہیں انہیں اس کی مرضی کے خلاف کسی اور کام میں صرف کرے۔(۳۲)

الحاصل یہ استاد کے ذمہ ہے کہ وقت متعینہ پر ادارے اور کلاس میں پہنچے اور وقت مکمل ہونے تک موجود رہے مزید برآں اسباق اور تدریس اور تربیت و انتظام میں مصروف رہے اور اپنے یہ کام بھی مقررہ اوقات میں پورے کرے۔

استاد ان تمام امور کے سلسلے میں نہ صرف متعلقہ ادارے کو جوابدہ ہے بلکہ وہ ادارے کی وساطت سے طلبہ، والدین، معاشرے اور حکومت سبھی سے معاہدہ کئے ہوئے ہے، اور اللہ کے سامنے بھی جوابدہ ہوگا۔

۲۔ سربراہِ ادارہ سے تعلق (اطاعت امیر)

ہر استاد لامحالہ اپنے پرنسپل، ہیڈ ماسٹر، صدر معلم، صدر شعبہ، وائس چانسلر وغیرہ کے ماتحت کام کرتا ہے اور اس کو اپنے ذمہ دار کے احکامات کے تحت ہی اپنے فرائض ادا کرنا ہوتے ہیں چنانچہ اس پر اپنے سربراہ کی اطاعت فرض ہے اور اس کا احترام بھی واجب ہے۔

کوئی بھی کام سربراہ کے احکامات سے ہٹ کر یا اس کو نظر انداز کر کے ادا کرنا نہ تو ممکن ہوتا ہے اور نہ ہی جائز۔ قرآن پاک میں اللہ جل جلالہٗ نے فرمایا:

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ج (۳۳)
حکم مانو اللہ کا اور اسکے رسول کا اور اپنے امیر کا

اسلام میں بیعت امیر کا حاصل یہی ہے کہ متعلقہ ذمہ دار کے تمام حقوق کا مکمل خیال رکھا جائے۔ اس کے حکم کو نہایت ادب و احترام سے سنا جائے اور پھر اس کی پاسداری و تعمیل کی جائے۔ (البتہ اطاعت صرف معروف میں ہے منکر میں نہیں)

احادیث نبویہ کی روشنی میں تو حکام کے ناروا اور ظالمانہ احکامات کو بھی خاموشی سے سننے اور ان پر عمل درآمد کی ہدایات موجود ہیں۔ (۳۴) تاکہ مسلمانوں کا نظام زندگی منتشر نہ ہو اور انتظامی خلفشار پیدا

نہ ہو (البتہ حاکم اپنی ظالمانہ کارروائیوں کے سلسلے میں خود خدا کو جوابدہ ہوگا)۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> میرے بعد ایسے حکمران ہوں گے جو میری رہنمائی سے ہدایت حاصل نہیں کریں گے، اور میری سنتوں پر عمل پیرا نہیں ہوں گے، اور ان میں ایسے لوگ کھڑے ہوں گے جن کے دل شیطانوں کے ہوں گے، انسانی حلیے میں۔ حضرت حذیفہ نے عرض کیا کہ اس وقت ہم کیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ امیر کی اطاعت کرنا اگرچہ وہ تمہاری پیٹھ پر مارے، (۳۵)

جب حکام کے ظالمانہ رویے پر صبر اور اللہ سے بدلہ لینے کا حکم ہے تو پھر حکام کے منصفانہ اور جائز احکامات سے روگردانی کس طرح جائز ہو سکتی ہے؟

اسی طرح حاکم و امیر کے احترام میں کمی کرنا اس وجہ سے بھی جائز نہیں کہ وہ شخص کسی جسمانی عیب یا نقص کا حامل ہے یا کسی نسلی و ذاتی کمتری کا حامل ہے۔ چنانچہ حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے کہ:

> **اسمعوا و اطیعوا و ان استعمل علیکم عبد حبشی کأنّ رأسه ذبیبةٌ (۳۶)**
>
> سنو اور کہنا مانو چاہے تم پر منقی جیسے سر والے حبشی غلام ہی کو امیر بنا دیا گیا ہو۔

اسی طرح اگر امیر کم عمر ہے یا اس میں صلاحیت کی کمی ہے تو زیادہ عمر والے اور زیادہ تجربہ کار با صلاحیت لوگوں پر بھی اس کی اطاعت لازم ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر حضرت اسامہؓ کو اکابر صحابہ کا امیر مقرر فرمایا عمر میں بھی چھوٹے تھے نسلاً بھی غلام زادے تھے اور صلاحیت و تجربہ میں بھی کمتر تھے۔ (۳۷)

حاکم کو نصیحت کرنا ضروری ہو تب بھی اس کے مرتبے کا لحاظ لازم ہے چنانچہ ارشاد نبوی ہے۔

> **من اراد ان ینصح بسلطان بامر فلا یبده له علانیة و لکن لیأ خذ بیده فیخلوا فان قبل منه فذاک و الّا کان قد ادّی الذی علیه. (۳۸)**
>
> [illegible] جو کوئی کسی سلطان [illegible] سمجھانا چاہے تو اسے چاہئے کہ اس کا [illegible] کرے، اگر حاکم [illegible] بات قبول [illegible] نصیحت [illegible] تو اپنا حق ادا کر [illegible]

ان احادیث سے [illegible] یہ نتیجہ اخذ کیا [illegible] حاکم کی اطاعت [illegible]

بہر حال واجب ہے خواہ حاکم ظالمانہ انداز اختیار کئے ہوئے ہو اور چاہے وہ فاسق ہی کیوں نہ ہو۔(۳۹)

احترام میں کھڑے ہونا: اس بارے میں اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تفصیل کچھ یوں ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں:

لم یکن شخص احبّ الیھم من رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال و کانوا اذا رأوہ لم یقوموا لما یعلمون من کراھیۃ لذالک. (۴۰)

صحابہ کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب شخص کوئی نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ جب حضور کو دیکھتے تو ان کیلئے کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ حضور کو یہ ناپسند تھا۔

اس حدیث مبارکہ کی تشریح کرتے ہوئے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

''ابوداؤد میں ہے کہ حضور مسجد میں ہمارے ساتھ باتیں کرتے تھے اور جب حضور ﷺ کھڑے ہو جاتے تو ہم بھی کھڑے ہو جاتے اور اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک حضور گھر میں نہ چلے جاتے۔'' اسی طرح اس بارے میں کتب حدیث میں بہت سی روایات ہیں حتیٰ کہ بعض روایات میں کھڑے ہونے کی سختی سے ممانعت ہے، اور بعض روایات میں بعض آنے والوں کیلئے کھڑے ہونے کا حکم بھی ہے۔ اسی وجہ سے علما اس کھڑے ہونے کے جواز اور عدم جواز میں مختلف ہو گئے ہیں اور اکثر محققین کی رائے یہ ہے کہ ان میں تعارض نہیں ہے بلکہ کھڑے ہونے کے اسباب اور وجوہ مختلف ہیں اسی وجہ سے احادیث میں مختلف احکام ملتے ہیں۔ ابوالولید بن رشد کہتے ہیں کہ کسی شخص کیلئے کھڑا ہونا چار طرح ہوتا ہے۔

۱۔ ایسے شخص کے واسطے کھڑا ہونا ناجائز ہے جو تکبر کی وجہ سے پسند کرتا ہو کہ جب وہ آئے تو لوگ کھڑے ہو جائیں۔

۲۔ ایسے شخص کیلئے کھڑا ہونا مکروہ ہے، جو متکبر تو نہیں ہے لیکن اندیشہ ہے کہ اس کے ساتھ اگر ایسا معاملہ کیا جائے تو اس میں تکبر اور عجب پیدا ہو جائے۔

۳۔ ایسے شخص کیلئے جائز ہے، جہاں تکبر وغیرہ کا اندیشہ نہ ہو۔

۴۔ ایسے شخص کے واسطے کھڑا ہونا مستحب ہے جو سفر وغیرہ سے آیا ہو، اس کے آنے کی خوشی میں کھڑا ہو جائے۔

قاضی عیاض کہتے ہیں کہ ممانعت اس قیام کی ہے جب بڑا آدمی بیٹھا رہے اور لوگ اس کے

سامنے کھڑے رہیں چنانچہ ممانعت کی احادیث میں یہ ارشاد بھی ہے کہ اس طرح نہ کھڑے ہو جیسا کہ عجمی لوگ اپنے سرداروں کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔

حضرت گنگوہی کی تحقیق جو بذل المجہود میں نقل کی گئی ہے یہ ہے کہ فی حد ذاتہ کھڑا ہونا جائز ہے، جب تک کہ کوئی عارض ایسا پیش نہ آئے جو اس کو ناجائز بنادے۔ مثلاً اس شخص کا فتنے میں پڑنا جس کے لئے کھڑا ہوا ہے کہ اس میں تکبر وغیرہ امور پیدا ہو جانے سے اس کو دینی نقصان پہنچے، اسی طرح سے نفاق کے طور پر کھڑا ہونا کہ جس کیلئے کھڑا ہوا ہے اس کی کوئی وقعت اور عظمت دل میں نہ ہو، ریاکاری اور نفاق کے طور پر کھڑا ہو کہ یہ صورتیں ناجائز ہیں اور ان میں بھی اگر کھڑے نہ ہونیکی صورت میں اس شخص کو خود کسی قسم کا جانی مالی یا آبرو کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کیلئے جائز ہوگا۔ (۴۱)

امام غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

''کسی کیلئے تعظیماً کھڑا ہو جانا عرب کا طریقہ نہ تھا۔ چنانچہ صحابہ بعض اوقات آنحضرت کیلئے کھڑے نہیں ہوتے تھے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے لیکن چونکہ اس کے متعلق کوئی نہی عام نہیں ہے اس لئے جن ملکوں میں اس کا رواج ہے ہمارے نزدیک وہاں قیام تعظیمی کرنا کچھ مضائقے کی بات نہیں۔ کیونکہ اس سے مقصود تعظیم وتکریم ہے۔ (۴۲)

ہمارے تعلیمی اداروں میں بچوں کو بڑوں کا ادب سکھانے کی غرض سے کھڑے ہونے کی روایت رواج پاگئی ہے لہذا بچے بڑوں کے احترام میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اور بچوں کے لئے بطور مثال اساتذہ اپنے بڑے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ تو ایسا کرنا استاد کے لئے مناسب اور کسی حد تک ضروری بھی ہے۔ البتہ استاد طلبہ کے کھڑے ہونے کو اپنے لئے ضروری نہ سمجھے، بلکہ محض تربیت کی غرض سے ان کے اس عمل کو دیکھے،

خیر خواہیٔ امیر : اسی طرح احادیث سے پتا چلتا ہے کہ حکام کی بدگوئی، عیب جوئی، اور ان کے خلاف سازش کرنا ناپسندیدہ عمل ہے۔ لہذا استاد کو خود ایسا کرنے اور ایسے عمل میں شریک ہونے سے اجتناب کرنا لازم ہے۔ اپنے امیر کی تبدیلی کے لئے کوشش کرنا یا اس کے فیصلوں پر نکتہ چینی کرنا اور غیر معیاری تبصرہ کرنا یہ سب کام ناپسندیدہ ہیں۔ البتہ دوسری طرف مثبت انداز میں نصیحت کرنا اور اچھا مشورہ دینا لازم ہے۔ لیکن تبدیلی اور اصلاح کی ہر وہ صورت جس کا نتیجہ انتشار اور بدامنی ہو بہر حال ممنوع ہیں۔

امام احمد بن حنبل کا فرمان حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے آپ نے ایک فاسق اور ظالم حاکم کے خلاف فقہا کو احتجاج کرنے سے منع فرمایا۔

دل میں اس کو برا سمجھو اور اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ اٹھاؤ اور مسلمانوں میں تفرقہ نہ ڈالو۔ (۴۳)

اسی طرح امیر اور حاکم کا قرب حاصل کرنے کی غرض سے اس کو غلط مشورے دینا اس کے ناروا کو جائز بتانا اس کی بے جا تعریف کرنا اور اس کو ہدیے اور تحفے وغیرہ دے کر اپنا مطلب نکالنا یہ سب امور غلط اور ناجائز ہیں۔

اسی طرح کسی ساتھی یا بچے کے بارے میں شکایات لیکر جانا، جائز طور پر یا ناجائز، دونوں صورتوں میں ناپسندیدہ ہے۔ اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ملتا ہے۔

لا یبلّغنی احدٌ من اصحابی عن احدٍ شیئاً فانّی احبّ ان اخرجَ الیکم و انا سلیم الصدر. (۴۴)

میرے صحابہ میں سے کوئی شخص مجھ تک کسی کے بارے میں کوئی بات نہ پہنچایا کرے کیونکہ میرا دل یہ چاہتا ہے کہ میں جب تمہارے پاس آیا کروں تو میرا دل تم سب کی طرف سے صاف ہو۔

اسی طرح ہمیں اسوۂ رسول ﷺ سے ایک صحابی کے قطع ید کا واقعہ رہنمائی کے طور پر ملتا ہے۔

ایک مرتبہ صفوان بن امیہ مسجد میں چادر سر کے نیچے رکھ کر سو رہے تھے جس کی مالیت تیس درہم تھی، ایک شخص آیا اور چادر نکال کر لے گیا، اسے پکڑ کر دربار رسالت میں پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے قطع ید کا حکم دیا، اسی اثنا میں صفوان پہنچے اور انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا تیس درہم کی چوری میں اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا، میں اسے یہ چادر فروخت کرتا ہوں قیمت یہ بعد میں ادا کر دے گا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے یہ کام ہمارے پاس آنے سے پہلے کیوں نہ کیا؟ (۴۵)

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مدرسہ کے ماحول کی اصلاح اور بچوں کی تربیت کے سلسلے میں اگر کوئی ایسی کوتاہی سامنے آرہی ہو جس کی اطلاع سربراہ تک پہنچانا ضروری ہو تو ایسی شکایت مثبت انداز میں محض اصلاح کی غرض سے اور کسی کو نقصان پہنچانے کی نیت کے بغیر امیر تک پہنچانا بھی لازم ہے

اسی طرح امیر کی طرف سے تفتیش پر کسی بات کو چھپانا یا گھٹا بڑھا کر پیش کرنا بھی غلط ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ○ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهُ اٰثِمٌ قَلْبُهُ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

عَلِیْمٌ (۴۶)

اور گواہی کو مت چھپاؤ اور جو شخص اس کو چھپاتا ہے تو بیشک اسکا دل گناہ گار ہے اور اللہ تو اس کو خوب جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

۳۔ تعلیم و تدریس و تربیت (ادائیگی فرض)

یہ استاد کے کام کا اصل میدان اور اس کی صلاحیتوں کا امتحان ہے آیئے ہم درسگاہ میں معلّم کی سرگرمیوں کو نمبروار دیکھتے ہیں۔

۱۔ درسگاہ میں داخل ہونا: معلم کو چاہئے کہ درسگاہ میں نہایت وقار اور چہرے پر بشاشت کے ساتھ داخل ہو اور سلام میں پہل کرے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے:

کنت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلّم فمرّ علی صبیان فسلّم علیھم (۴۷)

میں نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ تھا جب آپ بچوں کے پاس سے گذرے تو آپ نے ان کو سلام کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ دیگر مواقع پر بھی یہی تھا کہ، آپ ﷺ سلام میں پہل فرماتے سلام میں پہل کرنا دراصل رفعت و عظمت کا سبب ہے اور استاد کو اس سے کترانا نہیں چاہئے۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

افشوا السلام کی تعلوا (۴۸)

سلام کو خوب پھیلاؤ تاکہ تم بلند ہو جاؤ۔

۲۔ قیامِ نظم و ضبط: درسگاہ میں داخل ہونے کے بعد استاد کی پہلی نظر اس بات پر ہونی چاہئے کہ تمام طلبہ سلیقے اور ضابطے کے ساتھ عمل تعلّم میں بغیر کسی مشکل و غفلت کے شریک رہیں اور سبق مکمل ہونے تک وہ پوری توجہ کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہیں۔ کیونکہ نظم و ضبط اوّلین چیز ہے جسکے بغیر درسگاہ اور تعلیم و تعلّم کا تصور ہی ناممکن ہے۔ لہٰذا استاد اپنی جماعت میں مثالی نظم و ضبط قائم کرے۔

نظم و ضبط کے قیام کیلئے استاد پوری درسگاہ پر نظر رکھے اور درسگاہ میں مناسب چہل قدمی جاری رکھے اس کے ساتھ ساتھ بعض طلبہ کو معید Monitor کے طور پر اپنے کام میں بھی شریک کرے۔

بطور معید بچے استاد کا بہت ہاتھ بٹاتے ہیں، نظم و ضبط قائم کرنے کے ساتھ ساتھ سبق پڑھانے یاد کروانے سننے اور کام چیک کرنے میں بھی یہ استاد کی بہترین مدد کرتے ہیں اور اس طرح بچوں کو تعلیمی عمل میں انفعالیت کی بجائے فعالیت کا کردار ادا کرنے کا موقع ملتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی نظم وضبط کا بہترین نمونہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے لے کر جہاد تک تمام اعمال میں نہایت عمدہ انتظامی وانضباطی طرز عمل اختیار فرمایا۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے،

لِکل حال عنده عتاد. (۴۹)

ہر کام کے لئے آپ کے ہاں (بہترین) انتظام ہوتا تھا۔

آپ نماز کی صفوں کی درستگی کا خوب خیال فرماتے تھے۔ (۴۹، الف) اسی طرح جہاد کی صفوں کو آپ خود اہتمام کے ساتھ درست فرماتے تھے اور لشکر کو مختلف حصّوں میں نہایت عمدگی سے ترتیب دیتے تھے۔ (۵۰) اسی طرح آپ کی مجلس علمی بھی نظم وضبط کی بہترین صورت کے ساتھ قائم ہوئی تھی جس کا حال حدیث مبارکہ میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

واذا تکلم اطرق جلسائه کانما علی رؤسهم الطیر (۵۱)

جب آپ ﷺ گفتگو فرماتے تو آپ کے پاس بیٹھنے والوں کا حال یہ ہوتا تھا گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں (کہ ذرا حرکت کی تو اڑ جائیں گے)۔

قرآن کریم نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کیلئے اہل ایمان کے طرز عمل کی شان اس طرح بیان فرمائی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰهُ لَکُمْ ۚ وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (۵۲)

اے ایمان والو جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کشادہ کرو تو جگہ کھول دو اللہ بھی (جنت میں) تمہارے لئے جگہ کشادہ کر دے گا، اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو بس اٹھ جاؤ۔

اس آیات کی روشنی میں اب اپنی درسگاہ کے بارے میں یہ استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ طلبہ کو اس مثالی نظم وضبط پر تیار کرے۔

مندرجہ ذیل دو اقدامات۔ نظم وضبط کے ضروری عناصر ہیں۔

الف۔ حاضری ب۔ درجہ بندی

الف۔ حاضری: طالب علم کا سبق میں حاضر رہنا تحصیل علم کی بنیاد ہے۔ لہذا استاد تمام بچوں کی حاضری کا خیال رکھے اور روزانہ ابتدا میں غیر حاضر رہنے والے بچوں کی مناسب سرزنش کرے اور حاضر باش بچوں کی حوصلہ افزائی کرے، ترغیب وترھیب کے ذریعے بچوں کو حاضر باش رہنے پر آمادہ کرے اور غیر حاضری کے نقصانات بتائے۔ اس کیلئے اسکول کی طرف سے مہیا کردہ رجسٹر حاضری میں روزانہ اندراج کرے، صدر مدرس اور والدین کو غیر حاضری کی فوری اطلاع دے۔

مسجد نبوی میں اگر چہ رسمی تعلیم کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا، تاہم واقعات سیرت سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سیکھنے کیلئے حاضری کا التزام فرماتے تھے اور اپنی غیر حاضری کو مضر خیال کرتے تھے۔ امام بخاری نے کتاب العلم میں ایک باب قائم کیا ہے، باب التناوب فی العلم۔ اس میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے انصاری بھائی کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باری باری حاضری کی حدیث نقل کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی درسگاہ میں حاضری کو کس قدر ضروری خیال کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اقدام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا کی تعمیل کی وجہ سے ہی ہوتا تھا۔ (۵۳)

اہل صفہ کی مثال تو ہمارے سامنے ہے ہی کہ وہ چوبیس گھنٹے مسجد نبوی میں قیام فرماتے تھے اور جب تک آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی تعلیم ضروری خیال فرماتے تھے وہ مستقل طور پر وہاں حاضر رہتے تھے۔ (۵۴)

ب۔ درجہ بندی: ہر جماعت میں مختلف صلاحیتوں کے حامل طلبہ موجود ہوتے ہیں۔ کوئی ذکی، کوئی فطین، کوئی ذہین، کوئی درمیانہ، کوئی غبی۔ استاد کو ایک وقت میں سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ لہذا ایک ہی وقت میں مختلف صلاحیتوں کے حامل بچوں کو درجہ بندی کے بغیر تعلیم دینا ممکن نہیں ہوسکتا۔ اس لئے استاد کو جماعت میں بچوں کے مختلف گروپ بنانے چاہئیں اور طلبہ کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق شریک سبق کرنا چاہئے۔ اس طرح تمام طلبہ بیک وقت مصروف رہیں گے، اور فارغ ہونے کی وجہ سے جو شرارتیں کرتا ہے اور نظم کو خراب کرتا ہے اس سے حفاظت رہے گی۔

فرق مراتب (درجہ بندی) کے متعلق حدیث پہلے گذر چکی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے ہر ایک سے اس کے مرتبے کے مطابق معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

۳۔ ابتدائے سبق: سبق کی ابتداء ہمیشہ بسم اللہ سے ہونی چاہئے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ O (۵۵)

پڑھ اپنے رب کے نام سے (شروع کرتے ہوئے) جس نے پیدا کیا۔

اور حدیث مبارکہ میں آتا ہے:

کل امرٍ لم یبداء فیه ببسم الله فهو ابتر (۵۶)

ہر وہ کام جو بسم اللہ کے بغیر شروع کیا جائے دم بریدہ (ناقص رہتا) ہے۔

۴۔ تدریس: استاد بچوں کی گذشتہ معلومات پر نئے سبق کی بنیاد رکھے اور بچوں کو آمادگی و گریز دونوں طرح کے سوالات کے ذریعے نئے سبق کی طرف متوجہ کرے۔ تاکہ تمام بچے انہماک و شوق کے ساتھ شریک درس ہو جائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی توجہ مبذول کروانے کیلئے کبھی سوال فرماتے اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہیلی بوجھنے کا سا انداز اختیار فرماتے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کے درخت کے بارے میں سوال فرمایا۔ (۵۷)

۵۔ تیسیر: سبق پڑھانے اور سمجھانے میں استاد آسان طریقہ اختیار کرے اور سہل الفاظ استعمال میں لائے۔ حدیث مبارکہ ہے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا

علموا ویسروا و لا تعسّروا بشروا ولا تنفروا (۵۸)

سکھاؤ اور آسانی کرو اور مشکل میں نہ ڈالو۔ خوشخبری سناؤ اور نفرت نہ دلاؤ (بھگاؤ مت)۔

یعنی سبق کو مشکل کر کے طالب علم کو بھاگ جانے اور جی کترانے پر مجبور نہ کرو۔

۶۔ قرآت (بلند خوانی): ہر نئے سبق (خصوصاً زبان Language کے مضامین) میں استاذ بلند آواز سے پہلے خود سبق کو پڑھتا ہے تاکہ طلباء الفاظ سے مانوس ہو جائیں اور نئے الفاظ کے تلفظ کو جان لیں۔ (۵۹) اسی طرح تفہیم (سمجھانے) کیلئے بھی آواز کو بلند کرنا پڑتا ہے۔ لہذا استاد کو اپنی آواز مناسب حد تک بلند رکھنی چاہئے کہ ہر طالب کو صاف صاف واضح طور پر سنائی دے سکے۔

قرآن کریم نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسوہ یوں بیان کیا ہے:

یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ (۶۰)

وہ ان (لوگوں) کے سامنے اس (اللہ) کی آیات تلاوت کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم با آواز قرآن کریم کی آیات کو تلاوت فرماتے تھے۔ جسے سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یاد بھی کرتے تھے اور لکھتے بھی تھے۔

امام بخاری نے اپنی الجامع الصحیح میں ایک باب قائم کیا ہے۔ "باب من رفع صوته بالعلم" یہاں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں۔

فنادیٰ باعلیٰ صوتہٖ ویلٌ لِلاعقاب من النّار (۶۱)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بلند آواز سے فرمایا "خشک پنڈلیوں کیلئے آگ کا عذاب ہے"۔

اس حدیث کے الفاظ "باعلیٰ صوتہٖ" سے امام بخاری یہ ثابت کر رہے ہیں کہ مدرس کو سبق کے دوران اپنی آواز کو بلند رکھنا چاہئے۔

۷۔ تفہیم سبق: سبق سمجھانے کیلئے مختلف مہارتیں اور ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں جو آگے آرہے ہیں۔

الف۔ ادائیگی الفاظ: سبق کو نہایت صاف واضح اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھایا جائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اس طرح بیان کرتی ہیں۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو تم لوگوں کی طرح سے جلدی جلدی لگاتار نہیں ہوتی تھی، بلکہ صاف صاف ہر مضمون دوسرے سے جدا ہوتا تھا، پاس بیٹھنے والے اچھی طرح (آسانی) سے ذہن نشین کر لیتے تھے۔ (۶۲)

لہٰذا استاد کا سبق اسی نہج پر ہونا چاہئے تاکہ طلبہ سمجھ سکیں۔

ب۔ تفہیم بذریعہ تکرار: استاد کو چاہئے کہ سبق اور الفاظ کو کئی مرتبہ دہرائے تاکہ ہر بچہ سن سکے اور سمجھ سکے۔ بخاری کی حدیث جو بلند آواز کے بارے میں سطورِ بالا میں بیان ہو چکی ہے، اس میں آگے چل کر یہ الفاظ بھی آتے ہیں۔ مرتین او ثلثا (۶۳) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات دو یا تین مرتبہ دہرائی

حضرت انس کا بیان ہے:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعيد الكلمة ثلثا لتعقل عنه (۶۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (جب کوئی بات فرماتے تو اس) بات کو تین مرتبہ دہراتے یہاں تک کہ وہ بات سمجھ میں آجائے۔

ج۔ تفہیم بذریعہ معانی: مشکل اور نئے الفاظ کے معنی بتلانا بھی استاد کی ذمہ داری ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے اور پھر اس کے معنیٰ و مطالب صحابہ کرام کے سامنے بیان فرماتے تھے۔ جیسا کہ خود قرآن حکیم کا بیان ہے۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۶۵)

وہ ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

یہاں درحقیقت قرآن حکیم کے معانی و مطالب کی تعلیم ہی مراد لی جاتی ہے۔

د۔ تفہیم بذریعہ امثال: سبق کو مثالوں کے ذریعے ذہن نشین کرنا اور سمجھانا آج کل ایک جدید تیکنیک شمار کی جاتی ہے، قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا طرز تعلیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارک اس انداز تفہیم سے لبریز نظر آتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۶۶)

اور یہ مثالیں ہم لوگوں کیلئے اس واسطے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ غور و فکر کر کے سمجھ لیں،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچوں نمازوں کے ذریعے گناہوں کی معافی کو پانچ نہروں میں غسل کی مثال کے ذریعہ سمجھایا۔ (۶۷)

اسی طرح سردیوں کے موسم میں درختوں کے پتے جھڑنے کی مثال دے کر نماز سے گناہوں کے جھڑنے کو سمجھایا۔ (۶۸)

۸۔ املا و کتابت: بچوں کو سبق لکھوانا اور لکھنا سکھانا ایک اہم سرگرمی ہے اور اس میں بھی استاد کو اپنی کوشش صرف کرنی پڑتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی نازل ہونے کے بعد کاتب صحابہ کرام کو بلاتے تھے اور خود اپنی نگرانی میں قرآن کریم لکھواتے تھے۔ اسی طرح سے آپ اپنے فرمودات کو بھی ضروری مواقع پر قلمبند کرواتے تھے۔ (۶۹)

تحریر کو معیاری اور موزوں بنانے کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی اقدامات فرمائے اسی طرح مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے کفار قیدیوں سے مدد لی۔(۷۰)

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: استعن بیمینک (۷۱)

اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو (اور ہاتھ سے لکھنے کی طرف اشارہ فرمایا)۔

ایک صحابی جو خود لکھنا نہ جانتے تھے ان کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات لکھوانے کا حکم فرمایا۔

اکتبوا لابی شاہ. (۷۲)

ابوشاہ کیلئے (میرا بیان) لکھ دو

تفہیم سبق کے بعد سبق کو محفوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے اور یہ بغیر کتابت کے ممکن نہیں ۔ لہذا استاد سبق پڑھانے کے بعد لکھوانے کا بھی ضروری اہتمام کرے۔

۹۔جوابی قرآت :طلبہ کی بلندخوانی : یہ جاننے کیلئے کہ طالب علم پڑھ سکتا ہے یا نہیں طالب علم سے بلند آواز میں سبق پڑھوانا ضروری ہوتا ہے۔ لہذا یہ بھی استاد کے ذمہ ہے کہ وہ طلبہ کو پڑھنے کیلئے کہے اور خود سنے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام سے قرآن کریم سنتے تھے، آپ مسجد نبوی کے مختلف حلقوں کا جائزہ لیتے تھے اور صحابہ کو قرآن پڑھتے ہوئے سنتے تھے۔(۷۳)

۱۰۔زبانی یاد کروانا (حفظ) : سمجھے ہوئے سبق کو زبانی یاد کر لینا اور حافظے میں محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس لئے استاد بچوں کو اسباق یاد کروائے اور ان سے سنے بھی۔

درسگاہ نبوی کا تو گویا سارا ماحول اسی ''حفظ'' کے گرد گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ آنحضرت قرآن پاک اور اپنے ارشادات کو حفظ کروانے کا اہتمام فرماتے تھے۔ رمضان المبارک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ مکمل قرآن کریم کا دور فرماتے تھے۔(۷۴)

زبانی یاد کروانے کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض کمزور حافظے والے صحابہ کو مختلف ترکیبیں اور دعائیں حافظہ تیز کرنے کیلئے تجویز فرماتے تھے۔(۷۵)

۱۱۔تفویض شدہ کام کا جائزہ: بچوں کے ذمّہ جب کوئی کام لگایا جائے خواہ

درسگاہ میں حل کرنے کیلئے یا گھر کیلئے تو اس کو چیک کرنا بھی ایک اہم تعلیمی سرگرمی ہے۔ اور یہ چونکہ ذمہ داری میں داخل ہے لہذا اس کا معلم کو خوب اہتمام کرنا چاہئے۔

۱۲۔ اصلاح : بچوں کا کام دیکھتے ہوئے اور سنتے وقت ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا اور اصلاح کرنا ضروری ہے تاکہ بچے آئندہ ان غلطیوں سے بچیں۔

تعلیماتِ نبویہ تو ساری کی ساری اصلاح کی حامل نظر آتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہر اس عمل کی اصلاح فرماتے تھے جو غلط ہو۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم غلط پڑھنے والوں، نماز صحیح طریقے سے ادا نہ کرنے والوں کی اصلاح فرماتے تھے۔ جیسا کہ ایک موقع پر ایک شخص رکوع وسجود کے درمیانی وقفوں قومہ اور جلسہ کو صحیح ادا نہیں کر رہا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو فرمایا کہ جاؤ دوبارہ نماز پڑھو، اور چند بار اسکو اسی طرح فرمایا یہاں تک کہ اس نے صحیح نماز ادا کی اور اپنی غلطی کی اصلاح کر لی۔ (۷۶)

آموزش کی جانچ (امتحان):

تعلیم وتدریس کے ساتھ استاد کے ذمے یہ بھی ہے کہ وہ بچے کے اکتساب کا جائزہ لیتا رہے، اس کے لئے امتحانات کے نہایت موزوں طریقے مرتب کرے، بچے کے جائزہ، اکتساب سے خود استاد کو اپنی کارکردگی کا بھی انداز ہوتا ہے کہ بچے نے کیا سیکھا اور تدریس کتنی کارگر ہوئی۔ لہذا استاد کو چاہئے کہ وہ طے شدہ اصولوں کے مطابق بچے کا امتحان لیتا رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک سے بھی صحابہ کرام کے امتحان کی مثالیں ملتی ہیں۔ صحیح جواب دینے والے صحابی کی آپ علیہ السلام حوصلہ افزائی فرماتے، انعام عطا فرماتے اور دعا فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت ابی بن کعب سے پوچھا کہ قرآن پاک کی سب سے فضیلت والی آیت کون سی ہے تو انہوں نے جواباً فرمایا کہ آیت الکرسی، آپ نے فرمایا اللہ تم کو تمہارا علم مبارک کرے۔ (۷۷)

استاد اس بات کا خاص خیال رکھے کہ دوران امتحان بچے کسی خارجی مدد سے مثلاً نقل وغیرہ کے ذریعے اپنے جوابات نہ لکھیں۔ کیونکہ اس طرح اس کی صحیح جانچ نہیں ہوسکتی اور اس کی صلاحیت اور اکتساب کا اندازہ نہ ہوسکے گا۔

استاد نقل کی سختی سے حوصلہ شکنی کرے۔ خود بھی امتحانی مقامات اور سوالات ہرگز نہ بتائے۔ ایسا

کرنے والا استاد دراصل پوری قوم کے ساتھ خیانت کرتا ہے، وہ بچے کے ساتھ بھلائی نہیں کرتا بلکہ اس کا مستقبل تباہ کرتا ہے۔

اسی طرح امتحانات کے نمبر دیتے وقت استاد انصاف کے ساتھ کام لے، نمبروں کا لگانا دراصل اس بات کی گواہی دینا ہے کہ بچے نے اس قدر صلاحیت حاصل کرلی ہے، یا کسی مضمون میں اتنی اہلیت حاصل کرلی ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ O (۷۸)

ناپ کرو بالکل صحیح پیمانے کے ساتھ۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (۷۹)

اے ایمان والو انصاف پر قائم رہو اور اللہ تعالیٰ کے لئے سچی گواہی دو۔

ان دونوں آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نمبروں کے ذریعے گواہی میں بھی پوری دیانت اور امانت کا خیال رکھا جائے۔کیونکہ طلبہ کے نمبر لگانا دراصل انکی صلاحیت کی پیمائش ہے، اور ناپ تول میں کمی بیشی ناجائز ہے، پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔استاد خیال رکھے کہ بالکل صحیح حقدار بچے کو اسکی قابلیت کے مطابق درجہ ملے، کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (۸۰)

بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے اس بات کا کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچادو اور جب تم لوگوں میں تصفیہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ:

ان ننزل النّاس منازلهم (۸۱)

ہر ایک آدمی کو اس کا جائز مقام عطا کرو۔

اس آیت اور حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ استاد طلبہ کی صلاحیت کی جانچ کے وقت نہایت ایمانداری [illegible] اپنی کمزوری اور خراب کارکردگی کو چھپانے کیلئے [illegible] مضمون کا

پرچہ چیک کرتے وقت اس بات پر مجبور کرے کہ وہ رعایت کرے اور بے جا نرمی کرے۔

بچوں کو امتحانی سوالات یا اہم مقامات بتا دینا اور مکمل کتاب پڑھانے کی بجائے منتخب اسباق پڑھانے پر اکتفا کرنا یہ پوری قوم کے ساتھ بد دیانتی اور بھیانک جرم ہے۔ قومی اور اجتماعی خیانت کے بارے میں احادیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔

اسی طرح امتحان کے دوران طلبہ کو استاد کا نقل کرانا نہایت بدترین جرم ہے اور یہ حرکت معاشرے کو مفید افراد مہیا کرنے کی بجائے معاشرے کیلئے مجرم تیار کرنے کے مترادف ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں جو عام بدعنوانی کا ماحول ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ استاد نے درس گاہ میں طالب علم کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی بجائے اس کی غلط تربیت کی اور اپنے فرض میں کوتاہی کر کے بچے کو مجرم بنا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کی قوم بدعنوانی کے راستے پر چل نکلی۔

استاد کو چاہئے کہ تعلیم کی دنیا میں ہر غلطی اور بدعنوانی کا دروازہ قطعی طور پر بند رکھے۔ ورنہ معاشرتی بدعنوانیوں کی ذمہ داری سے استاد بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ آج استاد معمولی ٹکوں کے عوض اور معمولی کام نکالنے کی خاطر امتحان گاہ اور درس گاہ دونوں جگہ اپنا ضمیر بیچ رہا ہے۔ اور اس طرح قوم کی بربادی کا سامان قوم کے معمار کے ہاتھوں دھڑا دھڑ تیار ہو رہا ہے۔

اسی طرح استاد کسی غرض و لالچ یا کسی تعصب کے تحت ہرگز کم یا زیادہ نمبر نہ لگائے۔ کیونکہ ایک طرف استاد بچے کی تربیت کا مکمل ضامن اور امین ہے اور دوسری طرف وہ قوم اور معاشرے کو جوابدہ ہے۔ لہذا استاد دونوں جانب کا خیال رکھے۔

فنی مہارتوں اور امدادی اشیا کا برمحل استعمال:

استاد تدریس کی تمام مہارتوں کا حسب موقع ضرور استعمال کرے۔ (۸۲) کبھی تغیر لحن اختیار کرے، کبھی نقشوں اور چارٹ کے ذریعے سبق کو موثر اور قابل فہم بنائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو تعلیم دیتے وقت یہ تمام مہارتیں استعمال فرماتے تھے۔ مثلاً کبھی آپ زمین وغیرہ پر لکیر بنا کر بات کو سمجھاتے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراط مستقیم اور شیطانی راستوں میں فرق نمایاں فرمایا۔ (۸۳)

اسی طرح استاد کو دوران سبق بعض خاص مضامین میں کبھی کبھی جوش خطابت اختیار [illegible]

ضروری ہوتا ہے۔ آپ ﷺ خطبات میں ایسا انداز اختیار فرماتے تھے۔

کانّه منذر جیشاً (۸۴)

گویا کسی حملہ آور فوج سے ڈرا رہے ہیں۔

اسی طرح استاد دوران سبق حسب موقع خوشی و مسرت اور مزاح کا استعمال کرے، کبھی ناگوار بات پر ناپسندیدگی اور غصے کا بھی اظہار کرے۔ یہ دونوں چیزیں اسوۂ رسول ﷺ میں موجود ہیں کہ حضور نے کبھی کسی اچھے عمل پر بخ بخ (واہ واہ) (۸۵) فرمایا اور کبھی غلطی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضگی کا بھی اظہار فرمایا۔ (۸۶)

اور کبھی استاد اعراض یعنی نظر انداز کرنے کا طریقہ بھی اپنائے یہ بھی اسوۂ رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ (۸۷)

حوصلہ افزائی: استاد کو چاہئے کہ وہ اچھا سبق یاد کرنے والے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرے اور انہیں دوسروں کے سامنے نمایاں کرے اور ان کو مثال بنا کر دوسروں کو بھی اچھا کام کرنے پر ابھارے۔

استاد بچوں کے دل کو بڑھائے اور انہیں احساس عزت دلائے ان کے اچھے کاموں پر فراخدلی سے تعریف کرے۔

آنحضرت ﷺ اپنے صحابہؓ کے کارناموں پر ان کو عمدہ القاب سے نوازتے تھے، حضرت ابوبکر کے لئے صدیق کا لقب، حضرت عمر کے لئے فاروق اور محدث کا لقب حضرت عثمان کیلئے کامل الحیاء والایمان کا لقب، حضرت علی کے لئے باب العلم کا لقب، حضرت خالد بن ولید کیلئے سیف اللہ کا لقب۔ اسی طرح دیگر پسندیدہ امور پر بھی حضور نے القاب عطا فرمائے جیسے حضرت عبدالرحمٰن کے لئے ابوہریرہ کا لقب انکے بلّیوں سے پیار کرنے پر عطا ہوا، اور ایک صحابی جس نے اپنے ساتھیوں کا بہت سا سامان اٹھایا ان کو سفینہ (جہاز) کا لقب عطا کیا۔

مساوات: استاد اپنے تمام طلبا کو یکساں نظر سے دیکھے اور ان کے مابین قوم و نسل کی بنا پر تفریق نہ کرے، البتہ صلاحیتوں کی بنا پر اور حسن کارکردگی کی بنا ان میں فرق مراتب ضرور رکھے۔ اور اس سلسلے میں بھی آنحضرت کا اسوۂ مبارک بالکل واضح ہے۔ آنحضرت ﷺ کی جماعت میں صحابہ کا حال یوں ہوتا تھا، صارو اعندہ فی الحق سوا، تمام لوگ حقوق میں آپ کے نزدیک برابر تھے۔ اسی روایت میں آگے آتا ہے:

متعادلين يتفاضلون فيه بالتقوى متواضعين يوقّرون فيه الكبير ويرحمون فيه الصغير ويؤثرون ذا الحاجه، ويحفظون الغريب (۸۸)

آپ میں سب برابر شمار کر لئے جاتے تھے۔ ایک دوسرے پر فضیلت تقویٰ سے ہوتی تھی ہر شخص دوسرے کے ساتھ تواضع سے پیش آتا تھا بڑوں کی تعظیم کرتے تھے۔ چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے۔ ضرورت مند کو ترجیح دیتے تھے اجنبی مسافر کی خبر گیری کرتے تھے۔

شفقت و رحمت اور تصور سزا : استاد بچوں کے لئے باپ کی مانند ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ:

انی انا لکم مثل الوالد (۸۹)

میں تمہارے لئے باپ کی طرح ہوں۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے پیار سے ''اے میرے بیٹے'' کہہ کر بلاتے تھے۔ (۹۰)

آنحضرت ﷺ کے اس طرز عمل کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ استاد طلبہ کے ساتھ ایک والد کا سا برتاؤ کرے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کی سات سال خدمت کی لیکن آپ ﷺ نے مجھے اف تک نہیں کہا، اور نہ کبھی یہ کہا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور یہ کیوں نہیں کیا۔ (۹۱)

جسمانی سزا کو آج جدید نظام تعلیم میں سختی سے ناپسند کیا گیا ہے اور استاد کیلئے بچے کو جسمانی سزا دینا ممنوع ہے۔ اسلامی تعلیمات نے آج سے چودہ سو سال پہلے ہی اس بات کو بیان کر دیا تھا کہ جسمانی سزا کسی طور طالب علم کے لئے مناسب نہیں۔

جامع صغیر کی ایک روایت کے مطابق ارشاد نبوی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت کرے جو گھر والوں کو تنبیہ کے واسطے گھر میں کوڑا لٹکائے۔ (۹۲)

اس حدیث مبارکہ اور اس جیسی دیگر روایات سے بظاہر مار پیٹ اور جسمانی سزا کا تصور ملتا ہے۔ لیکن دوسری طرف حضور کا اپنا طرز عمل ہے جیسا کہ اوپر حضرت انس کا بیان گذرا اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے، وہ فرماتی ہیں:

ماضرب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بیدہ شیئاً قطُّ الّا ان یجاھد فی سبیل اللّٰہ ولا ضرب خادماً ولا امرأۃ (۹۳)

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے ہاتھ سے کبھی کسی کو نہیں مارا سوائے اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے۔ اور آپ نے نہ تو کبھی کسی خادم کو مارا اور نہ ہی بیوی کو مارا۔

حضرت امام غزالی نے احیاء العلوم میں بچے کی جسمانی سزا کو ناپسند لکھا ہے انہوں نے امر فاحش پر تنبیہ کے لئے بھی مندرجہ ذیل تدریج قائم کی ہے۔

۱۔ چشم پوشی یعنی نظر انداز کرنا۔

۲۔ اگر طالب علم مسلسل غلطی کا ارتکاب کرے تو اس کی علیحدگی میں محض سرزنش یعنی باز پرس

۳۔ پھر بھی کچھ اثر نہ ہو تو اس کے ساتھیوں کے سامنے تنبیہ کی جائے۔

۴۔ اس کے باوجود ٹھیک نہ ہو تو اسکو تین چھڑیوں سے زیادہ سزا نہ دینی چاہئے۔ (۹۴)

مشہور مفکر تعلیم ابن خلدون نے بھی جسمانی سزا کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ (۹۵)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی اپنے مدرسے میں اساتذہ کو سزا دینے سے قطعی طور پر منع کرتے تھے۔ ان کے ہاں اصول تھا کہ طالب علم کو غلطی پر استاد کوئی جسمانی سزا نہ دے بلکہ ذمہ دار کو اطلاع کرے اور بار بار کے سمجھانے پر بھی طالب علم نہ مانے تو اس کے سرپرست کو اطلاع کی جائے۔ (۹۶)

ان تینوں بزرگوں کا یہ موقف ظاہر ہے سیرت نبوی سے ماخوذ و مستفاد ہے۔

قرآن کریم نے آنحضرت ﷺ کی یہ شان بیان کی ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ص (۹۷)

پس اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لئے نرم خو ہو گئے اور اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے دور ہو جاتے۔

یعنی شفقت و نرمی ایک استاد کی صفت لازم ہے اور سختی اور درشتگی صفت مذمومہ ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔

من یحرم الرفق یحرم الخیر کلہ (۹۸)

جو نرمی سے محروم رہا وہ پوری خیر سے محروم رہا۔

ایک حدیث مبارکہ میں چہرے پر مارنے کی سختی سے ممانعت ہے۔

الغرض اسوۂ رسول پر جب نگاہ ڈالی جاتی ہے تو وہاں جسمانی سزا ناپسندیدہ ہی نظر آتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف شفقتوں اور رحمتوں کی بارش اور فیضان نظر آتا ہے۔ لہٰذا استاد کو ہر ممکن طور پر اپنے آپ کو شفقت کا نمونہ بنالینا ضروری ہے۔

دل شکنی سے پرہیز جسمانی سزا کے ساتھ ساتھ استاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے وہ دل شکنی اور ناپسندیدہ جملوں سے پرہیز کرے، خوامخواہ بددعائیں دینا کوئی مناسب طرز نہیں، بلکہ ممنوع ہے، اس لئے استاد کو چاہئے کہ وہ طلبہ کو اپنی زبان سے بھی ایذا نہ پہنچائے۔ جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:

المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ. (۹۹)

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

یہاں ہاتھ پر زبان کو مقدم رکھا گیا ہے کیونکہ زبان سے ایذا دینا ہاتھ کی نسبت آسان ہوتا ہے،

استاد طالب علم کو لعن طعن بھی نہ کرے مومن کی شان بیان کی گئی ہے۔

لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان (۱۰۰)

مومن طعنہ دینے والا اور لعنت بھیجنے والا نہیں ہوتا۔

لہٰذا ایک استاد کو طالب علم کے حق میں اس امر کا کہیں زیادہ خیال رکھنا ضروری ہے۔

اس طرح استاد طالب علم کو اس کی نسلی کمتری یا جسمانی نقص وعیب یا معاشرتی پستی کی وجہ سے نہ تو زبان سے کچھ کہے اور نہ ہی دل میں گھٹیا سمجھے، بلکہ ایسے طالب علم کو اس کی کسی کمی کا احساس نہ ہونے دے، بلکہ اس کو احساس عظمت دلائے۔

حدیث مبارکہ میں حضرت ابوذر کا قصہ آتا ہے کہ انہوں نے حضرت بلال کو "یا ابن السوراء" اے حبشن (کالی عورت) کے بیٹے کہہ کر پکارا تو آنحضرت نے اس بات پر ناپسندیدگی ظاہر کی اور فرمایا۔

انک امرؤا فیک الجاھیلہ. (۱۰۱)

اے ابوذر! ابھی تک تمہارے اندر جاہلیت کی ایک عادت موجود ہے۔ (جو ایمان والے کی شان سے بعید ہے)۔

قرآن حکیم نے بھی ہمیں وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۱۰۲) (لوگوں سے اچھی بات کرنے) کی

ہدایت کی ہے، اس لئے استاد کی زبان سے طلبہ کے لئے ہمیشہ اچھے الفاظ ادا ہونے چاہئیں۔

اس سلسلے میں ایک حکایت نقل کی گئی ہے جو نہایت سبق آموز بھی ہے اور مناسبِ حال بھی، ایک بادشاہ اس کا وزیر اور کوتوال تینوں شکار کے لئے گئے۔ جنگل میں شکار کی تلاش میں تینوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ چنانچہ شام ہونے پر تینوں الگ الگ ہی شہر کو واپس لوٹے۔ سب سے پہلے داروغہ شہر پناہ کے دروازے پر واپس پہنچا۔ وہاں ایک نابینا فقیر موجود تھا۔ چنانچہ داروغہ نے فقیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''ابے اندھے یہ تو بتا کہ ابھی کچھ دیر پہلے کوئی شہر میں داخل تو نہیں ہوا''۔ فقیر نے جواباً کہا نہیں داروغہ جی کوئی نہیں آیا۔

بعد میں وزیر دروازے پر پہنچا۔ اس نے بھی اندھے فقیر سے پوچھا میاں جی کچھ دیر پہلے شہر میں کون داخل ہوا۔ فقیر نے جواب دیا کہ داروغہ جی گئے ہیں۔

آخر میں بادشاہ دروازے پر واپس پہنچا تو بادشاہ نے بھی فقیر سے پوچھا شاہ جی کچھ دیر پہلے شہر میں کون داخل ہوا۔

فقیر یہ سن کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور بادشاہ سے جان کی امن طلب کی اور پھر جواب دیا کہ پہلے داروغہ جی آئے تھے پھر وزیر باتدبیر تشریف لائے اور اب آپ جہاں پناہ رونق افروز ہوئے ہیں۔

بادشاہ اندھے فقیر کے جواب پر حیران ہوا اور پوچھا کہ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ فلاں فلاں آیا ہے۔ یعنی آنکھوں سے تو نظر نہیں آتا پھر کیسے پہچانا؟

تو فقیر نے جواب دیا کہ جناب جب داروغہ جی تشریف لائے تو انہوں نے ''ابے اندھے'' کہہ کر، مجھے مخاطب کیا میں الفاظ سے سمجھ گیا کہ جناب داروغہ جی ہیں، جب وزیر صاحب تشریف لائے تو انہوں نے ''میاں جی'' کہہ کر مجھے مخاطب کیا میں ان کے الفاظ سے سمجھ گیا کہ وزیر باتدبیر ہیں۔ اب آپ حضور والا تشریف لائے ہیں اور آپ نے مجھے ''شاہ جی'' کہہ کر مخاطب فرمایا میں سمجھ گیا کہ شاہ کی زبان سے شاہ ہی نکلتا ہے۔ لہذا میں پہچان گیا کہ آپ بادشاہ سلامت ہیں۔

ایک استاد چونکہ معاشرے کی اہم اور علامتی شخصیت ہے، لہذا اس کی زبان کے الفاظ بھی اس کی رفعت شان کے مطابق ہونا چاہئیں۔ دراصل الفاظ شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

اسی طرح طالب علم کے لئے ایسے الفاظ کہنا کہ تو کبھی نہیں پڑھ سکتا، تو کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہ الفاظ تو اللہ کو سخت ناپسند ہیں اور خدا کو غصہ دلانے والے ہیں ایسے ریمارکس تو اللہ جل شانہ نبی کی

زبان سے کافروں کیلئے بھی سننا پسند نہیں فرماتے۔

غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کو عارضی طور پر شکست ہوئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز رشتہ دار اور صحابہ جانثار شہید ہو گئے جن میں حضرت حمزہ بھی شامل تھے اور دوسری طرف خود آنحضرت ﷺ بالکل تنہا کفار کے نرغے میں آ گئے تو عتبہ نے آپ کو ایک پتھر مارا جس سے آپ پہلو کے بل گر گئے۔ آپ کا رباعی دانت ٹوٹ گیا اور نیچے کا ہونٹ زخمی ہو گیا۔ ابھی آپ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ابن شہاب نے آگے بڑھ کر آپ کی پیشانی زخمی کر دی۔ اس کے فوراً بعد ایک مشرک ابن قمئہ نے آپ کے کندھے پر سخت تلوار ماری جس کی تکلیف اتنی شدید تھی کہ آپ ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ تک اسے محسوس کرتے رہے اس کے بعد اس ابن قمئہ نے پھر حملہ کیا اور آنکھ کے نیچے رخسار مبارک کی ہڈی پر تلوار مار کر چہرہ انور کو زخمی کیا اور آواز کسی ''اسے لے میں تو توڑنے والے کا بیٹا ہوں'' ان پے در پے زخموں اور زبانی طعنوں سے جو صدمہ دل پر طاری ہو سکتا ہے انسان اس کا اندازہ لگائے، اور ایسے موقع پر کفار کے لئے جو سخت سے سخت ریمارکس دیئے جا سکتے ہیں ان کو سوچا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ابن قمئہ کے سخت حملے اور توہین آمیز جملے کے بعد فرمایا۔

وہ قوم کیسے کامیاب ہو سکتی ہے جس نے اپنی نبی کے چہرے کو زخمی کر دیا اور اس کا دانت توڑ دیا (۱۰۳)

طبرانی کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:

اس قوم پر اللہ کا سخت عذاب ہو جس نے اپنے نبی کا چہرہ خون آلود کر دیا۔ (۱۰۴)

غور کیا جائے کہ اس سخت موقع پر ایسے الفاظ کہنا اور بددعا کرنا بظاہر کتنا روا اور کتنا درست تھا لیکن چونکہ قسمتوں کا فیصلہ اور مستقبل کا حال اللہ کے اختیار اور علم میں ہے اس لئے فوراً آنحضور پر وحی نازل ہوئی اور ان الفاظ میں آپ کو متنبہ فرمایا گیا۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْيَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ O (۱۰۵)

آپ کو (یہ کہنے کا) کوئی اختیار نہیں، اللہ چاہے تو انہیں توبہ کی توفیق دے اور چاہے تو ان کو عذاب دے کہ وہ لوگ ظالم ہیں۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر متنبہ ہوئے اور آپ نے بعد ازاں قوم کی ہدایت کے لئے دعا فرمائی۔

اللّٰھم اغفر لقومی فانّھم لایعلمون (۱۰۶)

اے اللہ میری قوم کو بخش دے کہ وہ جانتے نہیں۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

اللّٰھم اھدِ قومی فانّھم لایعلمون (۱۰۷)

اے اللہ میری قوم کو ہدایت فرما کہ بیشک وہ جانتے نہیں

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے والے کئی کافر بعد میں ایمان لے آئے اور آپ ﷺ کے ساتھی بن کر کامیاب ہو گئے۔

ابوسفیان جو کفار کے سرغنہ تھے ایمان لائے۔ خالد بن ولید جنہوں نے کفار کا پانسہ پلٹا اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا، وہ نہ صرف ایمان لائے بلکہ سیف اللہ بنے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل وحشی بعد ازاں مسلمان ہوا، حضرت حمزہؓ کا مثلہ کرنے والی اور کلیجہ چبانے والی ہند ایمان لائی۔ ظلم وعداوت کے ایک اہم کردار ابوجہل کا بیٹا عکرمہ مسلمان ہوا۔ رضی اللہ عنہم

لہٰذا ایک استاد ایسے خطرناک الفاظ بول کر (خصوصاً طلبہ کے بارے میں) اللہ کی ناراضگی مول نہ لے، اور اللہ کے معاملات میں لب کشائی نہ کرے، بددعا نہ کرے، اور طلبہ کے لئے استاد کو نہیں معلوم کہ کس بچے کا کیا مستقبل ہے۔ اللہ کب اس کو کامیابی کی طرف بڑھا دے۔ کب کسی کا دل پھیر دے، کب کسی کی کایا پلٹ دے۔

البتہ استاد اسوۂ رسول کے مطابق اپنی پوری محنت وکوشش کے بعد دعائے خیر کرتا رہے اور نتیجے کو خدا پر چھوڑے رکھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرداً فرداً اور جماعت کے لئے دونوں طرح سے اپنے صحابہ کیلئے دعا کرنا ثابت ہے اور آپ اس کا التزام فرماتے تھے۔ (۱۰۸)

حدیث میں آتا ہے:

ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے مگر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ (۱۰۹)

دراصل قدرت بچہ کو ایک کورے کاغذ کی طرح استاد کے حوالے کرتی ہے۔

اب آگے یہ استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کورے کاغذ پر اپنی محنت اور خلوص کے ذریعے خوبصورت نقوش مرتب کرے اور اس کی شخصیت کو باکردار بنائے۔

مزاح اور خوشدلی : استاد بچے کی عمر کے لحاظ سے اس کی فطری شوخیوں (شرارتوں) سے تنگ نہ آئے بلکہ بچے کی ان معصوم حرکات سے خود بھی محظوظ ہو اور ان حرکات کو بہتر تربیت کے سانچے میں ڈھالے۔

آنحضرت علیہ السلام بچوں سے مزاح اور دل لگی فرمایا کرتے تھے، حالانکہ آپ معلم اعظم اور محسنِ انسانیت ہیں۔ عبداللہ بن الحارث کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے زیادہ مزاح (خوش طبعی) کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ (۱۱۰)

ایک مرتبہ آپ نے ایک بچے سے جو اپنا بلبل مرنے کی وجہ سے غمگین تھا اس طرح مزاح فرمایا۔

یابا عمیر مافعل النغیر (۱۱۱)

اے ابوعمیر تیری بلبل کا کیا بنا۔

آپ علیہ السلام مزاحاً حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یوں مخاطب فرماتے:

یا ذا الاذنین (۱۱۲)

اے دو کانوں والے۔

ہندوستان کے ایک مشہور صوفی بزرگ اور شاعر مرزا مظہر جان جاناں اپنی نازک مزاجی کی وجہ سے بہت معروف ہیں۔ آپ بادشاہِ وقت کی بھی ذرا سی غلطی اور کوتاہی کو برداشت نہ کر پاتے تھے، اور اس کو اپنی مجلس میں حاضری سے منع کر دیا کرتے تھے۔

انہی کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ اپنے ایک مرید سے کہا کہ تم کبھی اپنے (چھوٹے) بچوں کو ہمارے پاس لے کر آؤ۔ مرید نے دل میں سوچا کہ حضرت تو بہت نازک طبع ہیں اور بچے شوخ و شریر ہوتے ہیں نہ جانے یہاں آکر کیا حرکت کریں اور حضرت کو ناگوار گذرے اور میری شامت آجائے، چنانچہ وہ اس خیال سے بچوں کو نہ لایا۔ بعد میں جب وہ حضرت کے سامنے آیا تو حضرت نے پوچھا کہ اپنے بچوں کو کیوں نہیں لائے۔ تب اس نے سوچا کہ اب تو لائے ہی بنے گی۔ اس نے گھر جا کر بچوں کو خوب سمجھایا بجھایا اور ڈرایا بھی کہ وہاں جا کر کوئی شرارت نہ کریں بلکہ سلام کرنے کے بعد چپ چاپ بیٹھ جائیں اور کسی بات کے پوچھنے پر بھی بس ہاں ناں میں (مختصر) جواب دیں۔

چنانچہ بچے باپ کی ہدایت کے مطابق حضرت کے سامنے سلام کر کے بالکل چپ چاپ بیٹھ گئے۔ حضرت نے ان کو پیار کیا اور کچھ چھیڑ چھاڑ کی تاکہ وہ اپنے بچپنے کا اظہار کریں لیکن وہ باپ کی ہدایت

کے مطابق سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد حضرت نے اپنے اس مرید سے کہا کہ میں نے تمہیں اپنے بچے لانے کو کہا تھا۔ اس پر وہ بولا حضرت یہ سامنے میرے ہی بچے تو ہیں۔ تو مرزا صاحب نے جواب دیا کہ یہ کوئی بچے ہیں یہ تو تیرے باوا لگتے ہیں، بچے تو ایسے ہوتے کہ کوئی میری پگڑی اچھالتا کوئی چادر کھینچتا الغرض حجرے میں اچھل کود کر کے خوب شرارتیں کرتا۔

مرزا صاحب کے اس جواب پر مولانا اشرف علی تھانوی نے کہا ہے کہ یہ دراصل حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج کی سلامتی اور اعتدال ہے کہ بچے سے شوخی ظاہر نہ ہونے پر حیران تھے کیونکہ شوخی وشرارت تو اس کی عین فطرت ہے اور یہ محمود ومطلوب ہے۔

ذاتی خدمت اور تحائف کے حصول سے پرہیز : استاد بچوں سے ذاتی خدمت ہرگز نہ لے اور نہ ہی ان سے تحفے تحائف قبول کرے، ایسا کرنے سے استاد طالب علم کی نظر میں بھی گر جائے گا، اور معاشرے کی نظر میں بھی۔

استاد کو آگے بڑھ کر خود طلبہ کے کام آنا چاہئے اور ہر طرح سے ان کی مدد اور قدر افزائی کرنی چاہئے۔ آنحضرت ﷺ کا طرز عمل صحابہ کے ساتھ سفر وحضر میں خدمت کرنے کا تھا، نہ کہ خدمت لینے کا،

ایک مرتبہ حضرت ابی بن کعبؓ نے اپنے ایک شاگرد سے ایک کمان تحفے میں قبول کر لی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم نے آگ کی کمان حاصل کر لی۔ (۱۱۳)

آنحضرت ﷺ نے علم کے بدلے طلبا سے خدمت اور ہدیے لینے کی ہمیشہ حوصلہ شکنی فرمائی۔

۴۔ دفتری اشیا کا استعمال: (امانت ودیانت)

استاد کو دوران تدریس مختلف قسم کی امدادی اشیا اور دیگر چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ادارہ یہ اشیا مہیا کرتا ہے۔ یہ تمام اشیا استاد کے پاس امانت ہوتی ہیں۔ مثلاً کاغذ قلم رجسٹر۔

اسی طرح بعض اوقات امتحانی فیس وغیرہ کی رقوم بھی استاد کے پاس جمع کی جاتی ہیں۔ کھیلوں کا سامان بھی استاد کی نگرانی اور سپردگی میں ہوتا ہے (فزیکل انسٹرکٹر ہونے کی صورت میں خصوصاً) اور سائنسی لیبارٹری کا مختلف النوع سامان بھی استاد ہی کی نگرانی میں ہوتا ہے۔

استاد ان تمام اشیا ورقوم کا محافظ وامین ہے۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ ان اشیا کی خوب حفاظت کرے، ان کو ضائع ہونے سے بچائے اور اسی طرح ان کے غلط استعمال ہونے سے بھی محفوظ

رکھے۔ ان اشیا کو نہ تو خود اپنے استعمال میں لائے اور نہ ہی بعض مخصوص طلبہ کو ان کے استعمال کی اجازت دے بلکہ ہر طالب علم کو یکساں طور پر فائدہ اٹھانے دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بعثت سے قبل بھی اپنی دیانت داری میں معروف تھے اور کافروں کو آپ سے بہتر اپنی اشیا کیلئے کوئی اور امین نہ ملتا تھا۔ سیرت رسول کی کتب آپکی امانت و دیانت کے واقعات سے لبریز ہیں۔ (۱۱۴)

کافروں نے جب آپکو جھٹلایا اس وقت بھی آپ نے اپنی اسی صفت صادق اور امین ہونے کا حوالہ دیا۔ قرآن نے حکایتاً یہ بات نقل کی ہے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ O (۱۱۵)

بیشک میں نے (راست بازی اور امانت داری کے ساتھ) ایک عمر تمہارے درمیان گذاری ہے (جس کے تم خود معترف ہو) تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

اسلامی تعلیمات انفرادی و اجتماعی مال و اسباب کی حفاظت اور ان اشیاء کے درست استعمال کا حکم دیتی ہیں اور ان میں خیانت سے واضح طور پر روکتی ہیں۔ (۱۱۶)

۵۔ اساتذہ کا باہمی تعلق (خلق باہمی)

ایک استاد اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ عمدہ اور بہترین برتاؤ رکھے اور باہمی اخوت، ہمدردی، رواداری اور ایثار جیسی صفات اور اخلاقِ کریمانہ سے پیش آئے۔ اپنے بڑوں کا ادب و احترام ملحوظ رکھے اور اپنے چھوٹوں کے ساتھ ہمدردانہ اور دوستانہ رویہ اپنائے، تاکہ حدیث مبارکہ کی منشا کو پورا کرنے والا ہو۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقّر کبیرنا (۱۱۷)

جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

طلبہ کے سامنے استاد دیگر ساتھیوں کی محض خوبیوں کو بیان کرے اور اس بات سے تو بہر حال گریز کرے کہ کسی کی کوئی کمزوری طلبہ کے سامنے بیان ہو، یہ بات قطعاً ممنوع ہے۔

اسکول کی چار دیواری کے اندر اساتذہ محض تعلیمی امور اور طلبہ کی تربیت و تادیب سے متعلق باتوں کو ہی زیر بحث لائیں، غیر تعلیمی معاملات اور خارجی مسائل و واقعات سے مدرسے کے ماحول کو پاک

رکھیں۔ اپنی ذاتی پسند و ناپسند کو ساتھیوں کے درمیان زیر بحث نہ لائیں۔

استاد دوسروں کی اچھائیوں پر ہی نظر رکھے اور برائیوں سے ہر ممکن صرف نظر کرے، بلکہ دوسروں سے محض اچھا گمان رکھے۔ حکم خداوندی ہے۔

اجْتَنِبُوْا كَثِيْراً مِّنَ الظَّنِ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِ اِثْمٌ (۱۱۸)

بچو بہت زیادہ گمان کرنے سے کیونکہ کچھ گمان گناہ بھی ہوتے ہیں۔

اور ایک طویل حدیث میں رسول ﷺ نے فرمایا:

بدگمانی سے بچتے رہو، کیوں کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ (۱۱۹)

باہمی بے تکلفی سے اجتناب تو بے حد ضروری ہے کیونکہ اس طرح ایک دوسرے کے احترام میں کمی آتی ہے اور ادب و لحاظ اور وقار و مروت جاتی رہتی ہے۔ بچہ فطری طور پر نقال ہوتا ہے وہ اساتذہ کو جس طرح کرتے ہوئے دیکھتا ہے اسی طرح کا عمل اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا اساتذہ کو باہمی معاملات میں اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔

ان خیارکم احاسنکم اخلاقاً (۱۲۰)

بیشک میرے نزدیک تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ شخص وہ ہے جس کے اخلاق تم میں سب سے اچھے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایّاکم والظنّ، فانّ الظنّ اکذب الحدیث ولاتحسّسوا ولاتجسّسوا ولا تنا جشوا ولا تحاسدوا ولا تبا غضوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللّٰہ اخواناً. (۱۲۱)

تم بدگمانی سے بچو اس لئے کہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے، اور کسی کی راز جوئی نہ کرو اور نہ جاسوسی کرو اور نہ قیمت بڑھانے کے لئے بولی دو اور نہ آپس میں حسد رکھو اور نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو اور نہ ایک دوسرے سے تعلق توڑو اور بھائی بھائی بن کر اللہ کے بندے بن جاؤ۔

سورۂ حجرات میں اللہ رب العزت نے معاملات کے سدھار اور حسن معاشرت کے بہت سے احکام ارشاد فرمائے ہیں۔ جن میں سے غیبت سے اجتناب اور کسی دوسرے کے نام بگاڑنے اور غلط

القابات سے پکارنے اور دوسروں کا مذاق اڑانے اور دوسروں کو گھٹیا سمجھنے سے منع کر دیا ہے۔ اساتذہ کو اپنے باہمی طرز عمل کیلئے سورۂ حجرات کے ان معاشرتی احکامات کا خوب خیال رکھنا چاہئے۔

اساتذہ قوم کے معمار اور رہنما ہیں۔ اُن کو ان اوامر کی خصوصاً پابندی اور لحاظ لازمی ہے۔ امور رذیلہ سے بچتے ہوئے اساتذہ کو اخلاق فاضلہ کا نمونہ بننا چاہئے، ایک دوسرے سے محبت اور احترام سے پیش آنا چاہئے اور سلام کو رواج دینا چاہئے اس سے محبت بڑھتی ہے اور حسن معاشرت کا ماحول بنتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا اسوہ اس بارے میں نہایت قابل رشک ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

لم یکن رسول اللّٰہ فاحشاً ولا متفحِّشاً ولا صخّاباً فی الاسواق ولا یجزی بالسئیۃ السیئۃ ولکن یعفو ویصفح (۱۲۲)

حضور اکرم ﷺ نہ تو طبعاً فحش گو تھے اور نہ ہی تکلّفاً فحش گو تھے اور نہ ہی آپ بازاروں میں چلاّ کر بولنے والے تھے اور نہ ہی آپ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے تھے بلکہ آپ تو معاف کر دیتے تھے اور ذکر تک نہ فرماتے تھے۔

شمائل ترمذی میں ہے کہ حضرت حسینؓ نے اپنے والد حضرت علیؓ سے آنحضرت کا اپنے ہم نشینوں سے برتاؤ پوچھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ خندہ پیشانی سے اور خوش اخلاقی سے متصف رہتے تھے۔ آپ نرم مزاج تھے، نہ آپ سخت گو تھے نہ سخت دل نہ آپ چلاّ کر فحش بات کرتے نہ بدکلامی فرماتے تھے۔ نہ عیب گیر تھے نہ زیادہ مبالغے سے تعریف کرنے والے، نہ زیادہ مذاق کرنے والے، آپ ناپسندیدہ بات سے اعراض فرماتے تھے کہ گویا سنی ہی نہیں۔ دوسرے کی کوئی خواہش آپ کو اگر پسند نہ آتی تو آپ اس کو مایوس بھی نہ فرماتے اور اس کا وعدہ بھی نہ فرماتے، آپ نے تین باتوں سے اپنے آپ کو بالکل الگ کر رکھا تھا۔ جھگڑے سے، تکبر سے اور لایعنی بات سے اور تین باتوں سے لوگوں کو بچا رکھا تھا۔ نہ کسی کی مذمّت فرماتے نہ کسی کو عیب لگاتے اور نہ ہی عیوب تلاش فرماتے تھے۔ آپ صرف وہی کلام فرماتے تھے جو باعثِ اجر وثواب ہو۔ (۱۲۳)

۶۔ حسن معاشرت:

استاد دیگر افراد کی طرح معاشرے کا ایک فرد ہے اور معاشرے میں رہنے والے افراد سے اس کو بھی لین دین اور معاملات کا سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ اب چونکہ اس کا مقام ایک منفرد اہمیت کا حامل ہے لہذا اس کو اپنے اس مرتبے کے لحاظ سے اعلیٰ کردار کا نمونہ ہونا چاہئے، تاکہ معاشرے پر اس کے اچھے اثرات مرتب ہوں۔ اسلام نے باہمی لین دین میں جن اعلیٰ صفات کا ذکر کیا ہے وہ تو استاد کو بدرجہ اتم اختیار کرنی ہی چاہئیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کو ایثار و درگزر سے اور اپنا حق چھوڑنے جیسی قربانی والی صفات تک پہنچنا ضروری ہے۔ اور خاص طور پر طلبہ کے والدین سے تعلقات میں تو استاد کو نہایت اعلیٰ کردار کا نمونہ بننا ضروری ہے۔ دوسرے کے کام آنے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کا جذبہ اس میں موجود ہونا چاہئے، اور دوسروں سے خدمت لینے اور کام نکالنے کی حرص اس کے اندر بالکل نہیں ہونی چاہئے،

استاد محض اللہ کی رضا، قوم کی بھلائی اور بچے کی خیر خواہی کی نیت سے تعلیم دے اور اس کے بدلے معاشرے سے ادنیٰ مفاد کی بھی نیت نہ کرے، بلکہ اپنے عمل کا بدلہ محض اللہ ہی سے چاہے کہ اس کے عظیم الشان عمل کا بدلہ محض اللہ ہی دے سکتا ہے کوئی اور ہرگز نہیں دے سکتا۔

معلمین انسانیت انبیاء اور رسل کا قول قرآن کریم میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۱۲۴)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اے میری قوم) میں تم سے اس (تعلیم) کا
کوئی بدلہ نہیں مانگتا میرا بدلہ تو محض جہانوں کے پروردگار کے پاس ہے

یہ تمام باتیں تعلیمات نبویہ سے ثابت ہیں۔ اور مسلم اساتذہ نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہے۔

استاد کو اس ارشاد کا نمونہ بننا چاہئے جو کہ ایک حدیث میں وارد ہے۔

ازھد فی الدنیا یُحبّک اللّٰہ، وازھد فیما عندا النّاس یُحبّک النّاس (۱۲۵)

تو دنیا سے بے رغبتی پیدا کر اللہ تجھے محبوب بنائیں گے اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہو جا لوگ بھی تجھ سے محبت کرنے لگیں گے۔

۷۔ حسن سیرت:

ایک استاد کو اپنی ذاتی زندگی میں بھی سادگی، خلوص اور تقویٰ جیسی صفات کا خصوصاً نمونہ بننا چاہئے۔ تمام مذہبی اقدار کو اختیار کرتے ہوئے استاد اخلاص اور خشیت الٰہی کو ہر دم اختیار کئے رکھے۔

ہر کام میں اپنے رب کی رضا کے حصول کا متلاشی رہے اور مخلوق خدا سے استغنا اختیار کرے، تعلیم وتدریس سے غرض اوّل رضائے الٰہی ہو اور غرض ثانی مخلوق خدا کو نفع پہنچانا۔ معاوضے کے طور پر جو کچھ ملے اس کو کسب حلال کے طور پر سمجھے، ذاتی اغراض اور شہرت اور محض روپیہ کمانے کو ہرگز مقصود نہ بنائے۔

اپنے علم و ہنر پر کبھی گھمنڈ اور ناز نہ کرے۔ اور مزید علمی ترقی اور خیر کا متلاشی و طالب رہے، اس مقصد کے لئے اگر مزید تربیت کی ضرورت محسوس کرے تو اس سے نہ ہچکچائے، انسان عمر کے ہر مرحلے پر کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے بڑوں سے تو سیکھتا ہی ہے۔ چھوٹوں سے اور اپنے طلبہ سے بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ اپنے علم و ہنر کے نفع بخش ہونے کی دعا کرتا رہے اور اکثر دعا۔ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا O (۱۲۶) ''اے رب میرے علم میں اضافہ فرما'' کا التزام کرتا رہے۔

حوالہ جات

۱۔ لسان العرب مادۂ ''علم''

۲۔ ایضاً

3- The Students Standard English urdu dictionary 710, P-362

4- Thorndike Comprehenslve dictionary N.Y.1958,P263

5- Encyclopedia of dictionaries Shipley0-Webstor

۶۔ سورۃ الجمعہ، آیت ۲

۷۔ سنن ابن ماجہ/ دار الفکر، بیروت/ ج ۱، ص ۹۸، رقم ۲۲۹

۸۔ سورۃ البقرہ، آیت ۳۱

۹۔ سورۃ العلق، آیت ۴، ۵

۱۰۔ سورۃ الرحمٰن، آیات ۱، ۳

۱۱۔ عجلونی/ کشف الخفاء/ مکتبہ دار التراث، بیروت/ ج ۱، ص ۷۲

۱۲۔ سورہ البقرۃ، آیت ۳۱

۱۳۔ تفسیر ابن کثیر/ ج ۱، ص ۷۳

۱۴۔ روح المعانی، علامہ آلوسی/ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۸۵ء/ ج ۲۷، ص ۹۸

۱۵۔ سورۃ الدھر، آیت ۳

۱۶۔ سورۃ ہود، آیت ۳۷

۱۷۔ کمالین (شیخ سلام اللہ دہلوی) حاشیہ جلالین (علامہ جلال الدین السیوطی و علامہ جلال الدین (المحلی)/ ص ۱۸۳ و ۲۸۸

۱۸۔ سورۃ الانبیاء، آیت ۸۰۔

۱۹۔ سورۃ السبا آیت ۲۱
۲۰۔ سورۃ یوسف، آیت ۶
۲۱۔ سورۃ یوسف، آیت ۴۷
۲۲۔ عجلونی/ کشف الخفاء/ ج ۱، ص ۳۱۴
۲۳۔ دیکھئے صحیح بخاری، کتاب الطب، اور ترمذی / ج ۳، ص ۲۴، ۲۹۔ ابواب الطب،
۲۴۔ امام غزالی/ احیاء علوم الدین/ ج ۱، ص ۱۹
۲۵۔ امام غزالی/ احیاء علوم الدین۔
۲۶۔ جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ کا ارشاد ہے والذین اوتوا العلم درجات (سورۂ مجادلہ، آیت ۱۱) اور حدیث میں فرمایا انما العلماء ورثة الانبیاء (ابن ماجہ/ ج ۱، ص ۲۲۳)
۲۷۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر پیشے میں علم وعلما/ قاضی اطہر مبارکپوری، شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند، انڈیا الغزالی از شبلی نعمانی اسلامی اکادمی، اردو بازار، لاہور/ ص ۱۳
۲۸۔ محمد بن سلامۃ بن جعفر القضاعی/ مسند شہاب/ موسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۴۰۷ھ/ ج ۲، ص ۲۲۳، رقم ۱۲۳۳۔
۲۹۔ تعلیم و نصاب اور طریق تدریس صفحہ ۲۰۵ پروفیسر سید ساجد حسین، رہبر پبلشرز، اردو بازار کراچی، بحوالہ William H.Burton "The Guidance of Learning Activities"
۳۰۔ ہیثمی/ مجمع الزوائد/ دارالفکر بیروت/ ج ۵، ص ۷، رقم ۹۰۳۷
۳۱۔ سورۃ المطففین، آیت ۱ تا ۳
۳۲۔ مفتی محمد شفیع/ اسلام کا نظام تقسیم دولت/ دارالاشاعت، کراچی/ ص ۴۱
۳۳۔ سورۃ النساء، آیت ۵۹
۳۴۔ مسلم/ الصحیح/ دارالکتب العلمیہ، بیروت/ ج ۳، ص ۲۳۷، رقم ۱۸۴۷
۳۵۔ مسلم/ الصحیح/ کتاب الامارۃ
۳۶۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام
۳۷۔ بخاری باب بعث النبی ﷺ رسالۃ/ ج ۲، ص ۶۱۲
۳۸۔ احمد/ المسند/ داراحیاء التراث العربی، بیروت/ ج ۴، ص ۴۰۶، رقم ۱۴۹۰۹۔
۳۹۔ جیسا کہ حدیث صلوا خلف کل بر و فاجر (بیہقی، السنن الکبریٰ، مکتبۃ دار الباز مکہ مکرمہ ۹۴/ ج ۴ ص ۱۹، رقم ۶۶۲۳) سے معلوم ہوتا ہے
۴۰۔ شمائل ترمذی، باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ/ ص ۲۴
۴۱۔ خصائل نبوی شرح (اردو) شمائل ترمذی مولانا محمد زکریا/ صفحہ ۱۹۷، ۱۹۸ مکتبۃ الشیخ کراچی
۴۲۔ الغزالی/ شبلی نعمانی/ ص ۷۲،
۴۳۔ ترمذی کتاب الفتن
۴۴۔ ابوداؤد باب فی رفع الحدیث من المجلس/ رقم ۴۸۹
۴۵۔ ابوداؤد/ باب من سرق من حرز
۴۶۔ سورۃ البقرۃ، آیت ۴۲
۴۷۔ ترمذی، باب التسلیم علی الصبیان/ ج ۲
۴۸۔ مجمع الزوائد/ ج ۸، ص ۶۵
۴۹۔ شمائل ترمذی/ ص ۲۴، عن الحسن
۴۹، الف۔ بخاری/ کتاب الصلاۃ، باب اقامۃ الصف من تمام الصلاۃ۔

۵۰۔سورۃ آل عمران ، آیت ۱۲۱۔ اور دیکھئے جامع ترمذی باب ماجاء فی القصف/ ج ۱،ص ۲۰
۵۱۔ شمائل ترمذی/ص ۲۵، حدیث حسن بن علی
۵۲۔ سورۃ المجادلۃ ، آیت ۱۱
۵۳۔ صحیح بخاری باب التناوب فی العلم/ ج ۱،ص ۱۹
۵۴۔ ملاحظہ کیجئے، عہد نبوی کے نظام تعلیم و تربیت میں صفہ اور اصحاب صفہ کا کردار/ ڈاکٹر حافظ محمد ثانی/ششماہی السیرہ عالمی/ شمارہ ۲،
۵۵۔ سورۃ العلق ، آیت ۱
۵۶۔ تفسیر ابن کثیر/ ج ۱،ص ۱۹
۵۷۔ سوال کے لئے دیکھئے، صحیح بخاری/ ج ۱،ص ۱۹، حدیث عن عبد اللہ الرحمٰن بن ابی بکرۃ اور پہیلی کے انداز کے لئے دیکھئے، صحیح بخاری/ ج ۱،ص ۱۴، حدیث ابن عمر
۵۸۔ مسند احمد/ ج ۱،ص ۲۸۳، عن ابن عباس اور صحیح بخاری میں حضرت انس سے بغیر لفظ علموا کے یہ حدیث آئی ہے۔/ ج ۱،ص ۱۶
۵۹۔ دیکھئے تدریس اردو/ص ۲۵۹، از پروفیسر سید ساجد حسین، رہبر پبلشرز، اردو بازار، کراچی
۶۰۔ سورۃ الجمعہ، آیت ۲
۶۱۔ صحیح بخاری/ ج ۱،ص ۱۵، عن ابن عمر
۶۲۔ شمائل ترمذی ، عن عائشہ باب کیف کان کلام رسول اللہ/ص ۱۵
۶۳۔ صحیح بخاری/ ج ۱،ص ۱۴، عن ابن عمر
۶۴۔ شمائل ترمذی، باب کیف کان کلام رسول اللہ عن انس/ص ۱۵
۶۵۔ سورۃ الجمعۃ ، آیت ۲
۶۶۔ سورۃ الحشر، آیت ۲۱
۶۷۔ صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ الخمس کفارۃ/ ج ۱، ص ۷۶، عن ابی ہریرہ
۶۸۔ مسند احمد۔
۶۹۔ تفصیل کے لئے دیکھے خطبات بہاولپور ڈاکٹر حمید اللہ، تاریخ قرآن مجید تاریخ حدیث شریف اور عہد نبوی میں نظام تعلیم
۷۰۔ ابن ہشام/ السیرۃ النبویہ/ دار المعرفہ، بیروت/ ج ۳،ص ۶۱۔
۷۱۔ جامع ترمذی/ ج ۲،ص ۷۶، عن ابی ہریرۃ
۷۲۔ ایضاً
۷۳۔ بخاری، کتاب العلم ابن عبد اللہ/ص ۲۵، عن ابن مسعود حدیث/ رقم ۴۵۸۲
۷۴۔ صحیح بخاری/ ج ۱،ص ۳،
۷۵۔ دیکھئے جامع ترمذی/ ج ۲،ص ۱۹۶،
۷۶۔ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ/ ج ۱،ص ۱۰۹،
۷۷۔ حکایات حوالہ شیخ الحدیث مولانا زکریا، صحیح ۱۰۲، کتب خانہ فیضی لاہور/ مشکوٰۃ المصابیح کتاب فضائل القرآن،
۷۸۔ سورۃ الشعراء، آیت ۱۸۲
۷۹۔ سورۃ النساء، آیت ۱۳۵
۸۰۔ سورۃ النساء، آیت ۵۸
۸۱۔ مقدمہ صحیح مسلم/ ج ۱،ص ۶
۸۲۔ نصاب و تعلیم اور طریقہ تدریس پروفیسر سید ساجد حسین باب نمبر ۴، ۷، ۸۔
۸۳۔ مسند احمد/ ج ۳،ص ۳۹۷
۸۴۔ ابن سعد/ ج ۱،ص ۳۷۶
۸۵۔ ابن حبان/ الصحیح / موسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۴۱۴ھ/ ج ۳،ص ۱۱۵۔
۸۶۔ معجم الکبیر ابو القاسم طبرانی/ مکتبۃ العلوم والحکم موصل، ۱۴۰۴ھ/ ج ۲۳،ص ۱۳۔ ابو داؤد/ ج ۲،ص ۳۲۱، رقم ۲۴۲۴
۸۷۔ شمائل ترمذی/ص ۱۶، فی روایۃ الحسن،

۸۸۔ شمائل ترمذی/ص ۲۴،
۸۹۔ ابن حبان/ ج ۴،ص ۲۷۹
۹۰۔ جامعہ ترمذی/ ج ۲،ص ۱۰۹۱،باب ماجاء فی یا بنی
۹۱۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب حسن الخلق،
۹۲۔ سیوطی/ الجامع الصغیر
۹۳۔ شمائل ترمذی/ص ۲۵، ماجاء فی خلق رسول اللہ
۹۴۔ فلسفہ تاریخ تعلیم/ اکرم قریشی، مجید بک ڈپو، اردو بازار، لاہور/ص ۱۱۱، ۱۴۸
۹۵۔ مقدمہ ابن خلدون/ص ۳۹۹
۹۶۔ آداب المعلمین / قاری صدیق احمد باندوی/ ص ۱۳، مجلس نشریات اسلام، کراچی
۹۷۔ سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۹
۹۸۔ صحیح مسلم باب فضل الرفق/ رقم ۶۵۹۸
۹۹۔ صحیح بخاری/ ج ۱،ص ۶، عن ابن عمر
۱۰۰۔ جامع ترمذی/ ج ۲،ص ۱۹
۱۰۱۔ صحیح بخاری/ ج ۱،ص ۹، باب المعاصی من امر الجاھلیۃ
۱۰۲۔ سورۃ البقرہ آیت ۸۳
۱۰۳۔ صحیح بخاری/ ج ۲، ص ۵۸۲، عن انس فتح الباری/ ج ۱،ص ۳۷۳
۱۰۴۔ طبرانی
۱۰۵۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۲۸
۱۰۶۔ فتح الباری/ ج ۷،ص ۳۷۳
۱۰۷۔ قاضی عیاض/ کتاب الشفاء/ ج ۱،ص ۸۱،
۱۰۸۔ ملاحظہ کیجئے، ترمذی/ کتاب الدعوات،
۱۰۹۔ جامع ترمذی، باب ماجاء کل مولود یولد علی الفطرۃ، عن ابی ہریرہ/ ج ۲،ص ۳۶
۱۱۰۔ خصائل نبوی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مکتبۃ الشیخ، کراچی، ص ۱۲۶
۱۱۱۔ شمائل ترمذی/ص ۱۷
۱۱۲۔ ترمذی/ باب صفۃ المزاح/ ج ۲،ص ۲۰
۱۱۳۔ فضائل قرآن شیخ الحدیث مولانا زکریا/ص ۴۹، روایۃ عبادہ بن صامت ابوداؤد/ ج ۲،ص ۱۲۹
۱۱۴۔ چنانچہ ہجرت کے موقع پر بھی جب مشرکین مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے تھے اس وقت بھی ان کی امانتیں آپ ﷺ کے پاس رکھی ہوئی تھیں۔
۱۱۵۔ سورۃ یونس آیت ۱۷
۱۱۶۔ سورۃ الانفال، آیت ۲۷
۱۱۷۔ جامع ترمذی/ ج ۲،ص ۱۴، عن انس
۱۱۸۔ سورۃ الحجرات، آیت ۱۲
۱۱۹۔ بخاری/ کتاب الادب۔
۱۲۰۔ بخاری/ ادب، باب حسن الخلق،
۱۲۱۔ مشکوۃ باب ماینھی عنہ من التھاجر والتقاطع
۱۲۲۔ شمائل ترمذی/ص ۲۵، عن عائشہ ماجاء فی خلق رسول اللہ ﷺ
۱۲۳۔ ایضاً، عن الحسن بن علی
۱۲۴۔ سورۃ الشعراء/ آیت، ۱۰۹
۱۲۵۔ ابن ماجہ
۱۲۶۔ سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۴

ماہنامہ المدینہ
ایڈیٹر: قاری حامد محمود قادری
سی، ۶۸۔ تیرھویں کمرشل اسٹریٹ، فیز ۲، ایکسٹینشن، ڈیفنس، کراچی،
فون: ۷۲-۵۸۸۶۰۷۱